الرسالہ
Al-Risala

November 1998 • No. 264 • Rs. 9

صبر کیا ہے

صبر پُر امن اور منصوبہ بند جدوجہد

کا دوسرا نام ہے۔

Mosque of Fez, Morocco

Size: 23.5×16cm,
Pages: 228; Rs. 125

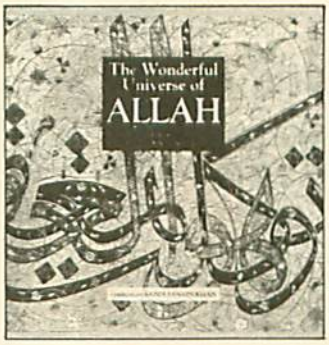

Size: 14×14cm,
Pages: 150; Rs. 95

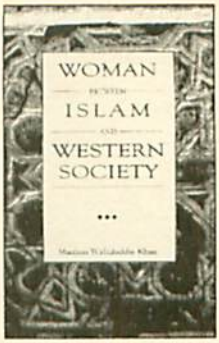

Size: 22×14.5cm,
Pages: 255; Rs. 95

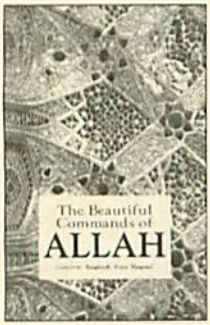

Size: 12.5×19 cm,
Pages: 192; Rs. 125

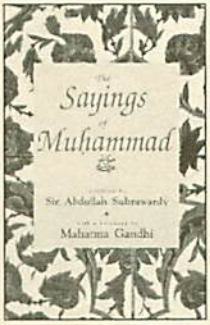

Size: 11.5×15 cm,
Pages: 128; Rs. 75

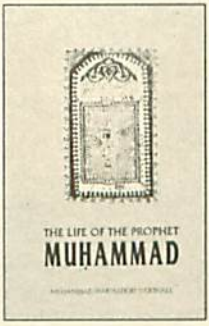

Size: 11.5×15 cm,
Pages: 64; Rs. 75

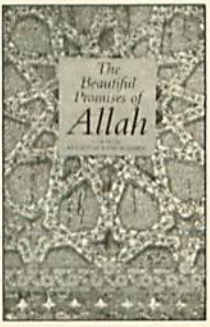

Size: 12.5×19cm,
Pages: 200; Rs. 175

Size: 12.5×19cm,
Pages: 168; Rs. 165

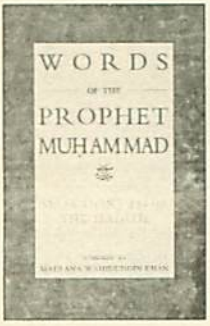

Size: 11.5×15cm,
Pages: 112; Rs. 75

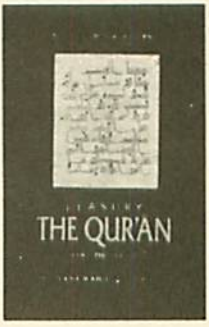

Size: 11.5×15cm,
Pages: 92; Rs. 75

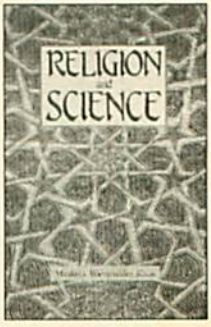

Size: 22×14.5cm,
Pages: 96; Rs. 55

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic @axcess.net.in

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near ovs Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

نومبر ۱۸۹۸، شمارہ ۲۶۴

فہرست — صفحہ

دور قرآن — ۴
کتاب فطرت — ۶
زندگی کیا ہے — ۷
برائی کے بعد — ۹
منصفانہ رویہ — ۱۰
اشاعت فاحشہ — ۱۱
ظالم انسان — ۱۲
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا — ۱۴
سائنسی مزاج — ۱۶
سفر امریکہ ۴ — ۱۸
سوال وجواب — ۴۶

دور قرآن

لندن کے انگریزی اخبار سنڈے ٹائمس میں ایک تفصیلی رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ کو مرتب کرنے والے جان ہارلو (John Harlow) ہیں۔ اس رپورٹ کا تعلق اصلاً بائبل سے ہے۔ اس کے ساتھ اس میں قرآن کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو دہلی کے انگریزی اخبار میں نقل کیا گیا۔

بائبل کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ دس سال پہلے تک مذہبی کتابوں میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب تھی۔ مگر اب اس کی مانگ میں قابل لحاظ حد تک کمی ہو گئی ہے۔ چنانچہ چرچ کی طرف سے بائبل کی مانگ کو برقرار رکھنے کی مختلف تدبیریں کی جارہی ہیں۔ مثال کے طور پر بائبل کے مختلف اجزاء کو نئے نئے عنوان دے کر چھاپنا۔

مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، عالمی مارکیٹ میں قرآن کے ترجمہ کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۸۱۵ اور ۱۹۷۵ کے درمیان بائبل کے ۲ بلین سے زیادہ نسخے تقسیم کئے گئے۔ مگر جہاں تک فروخت کا تعلق ہے وہ نمایاں طور پر کم ہو گئی ہے جب کہ قرآن کے ترجمہ کی فروخت مسلسل طور پر بڑھ رہی ہے۔ ایک پبلشر کلیر پیٹرسن (Claire Paterson) نے کہا کہ اب ہمیں قرآن کا ترجمہ چھاپنا چاہیئے۔

More than 2.5 billion Bibles were distributed between 1815 and 1975, but sales have markedly slowed down while those of the Koran have continued to increase. Claire Paterson, a Canongate editor,said:Maybe we should do the Koran next.(The Sunday Times)

(The Times of India ,New Delhi, August 16,1998)

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مختلف واقعات پیش آرہے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ شاید اب وہ دور آگیا ہے جس کو مسند احمد کی ایک روایت میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔ یعنی ایک ایسا دور آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا میں پھیلے گا اور وہ ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔

یہ اتنا بڑا کام ہے جو صرف اہل اسلام کے ذریعہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس منصوبہ کو واقعہ بنانے کے لئے دوسری قوموں کو اس عمل (process) میں شریک کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف بخاری کی ایک روایت میں اشارہ موجود ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ اس دین کی تائید فاجر آدمی سے بھی کرے گا (ان اللہ لیؤید ہذا الدین بالرجل الفاجر)

اشاعت اسلام کے اس بین اقوامی منصوبہ کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے پچھلی صدیوں کے درمیان بہت سی بڑی بڑی تبدیلیاں فرمائیں۔ اس کے لئے مذہبی آزادی کا دور لایا گیا۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد ہوئی۔ کمیونی کیشن کو اس حد تک بڑھایا گیا کہ ساری دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئی۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق عام ہو گیا۔ مختلف تحقیقات ایسی سامنے آئیں کہ ان کے بعد اسلام کو نئی علمی اور تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی۔ پڑول کے ظہور کے بعد اسلام دوبارہ دنیا والوں کے لئے قابل توجہ چیز بن گیا۔

اس طرح کے مختلف حالات نے ادخال کلمہ کے پراسس کو موجودہ زمانہ میں تیز تر کر دیا ہے۔ یہ اشاعتی پراسس یقینی طور پر مسلسل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نشانہ تک پہنچ جائے۔

کتاب فطرت

انسان کو دنیا میں کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اپنے خالق کی معرفت کے لئے۔ معرفت رب ہی اس دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا حاصل ہے۔ جو آدمی مخلوقات میں خالق کی دریافت کر لے وہی صاحب معرفت ہے اور جو صاحب معرفت ہے وہی خدا کا وہ مطلوب انسان ہے جس کے لئے آخرت کی ابدی دنیا میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اس مقصد کے لئے خدا نے پوری کائنات کو ایک کھلی ہوئی کتاب بنا دیا۔ یہاں ایک سورج ہے۔ یہ گویا عظیم خدائی ٹارچ ہے جو اندھیرے میں چھپی ہوئی خبروں کو اجالے میں لا کر ان کو قابل مشاہدہ بنا دیتا ہے۔ یہاں دریاؤں اور سمندروں کے مناظر ہیں جو خدا کی صفات رحمت کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔ یہاں پہاڑ اور درخت ہیں جن کو دیکھ کر آدمی روحانی غذا حاصل کرتا ہے۔ یہاں ہوا کے جھونکے ہیں جو ہر شخص کو لمس ربانی کا تجربہ کراتے ہیں۔ یہاں چڑیوں کے چہچہے ہیں جو صبح و شام آدمی کو خدائی نغمے سنا رہے ہیں۔

یہ کتاب فطرت ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ کامل طور پر درج ہے جو آدمی کو جاننا چاہیئے۔ اس کتاب میں علم و آگہی کا وہ پورا ذخیرہ رکھ دیا گیا ہے جس کو دریافت کر کے آدمی اپنی اعلیٰ روحانی تعمیر کر سکے۔ خدا کے نزدیک محروم وہ نہیں ہے جو مال و دولت سے محروم ہو۔ بلکہ محروم وہ ہے جو اس خزانہ فطرت سے اپنا حصہ نہ لے سکے۔ اندھا وہ نہیں ہے جو آنکھ کا اندھا ہو، اندھا وہ ہے جو بصیرت کی صلاحیت سے خالی ہو۔ جاہل وہ نہیں ہے جو مشرقی اور مغربی درسگاہوں کی ڈگریاں نہ رکھتا ہو۔ بلکہ جاہل وہ ہے جس کو رب المشرقین والمغربین کی درس گاہ سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا مگر وہ محرومی کی حالت میں اس دنیا سے چلا گیا۔

زندگی کیا ہے

زندگی کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے مرکزی تصور کیا ہے۔ وہ کون سا بنیادی نکتہ ہے جس کی روشنی میں زندگی کے تمام معاملات کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

خدائی تعلیم کے مطابق، یہ مرکزی نکتہ یا بنیادی تصور، صرف ایک ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ ابتلاء (الملک ۲) ہے۔ یعنی آزمائش (test)۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی خدائی ٹسٹ پر ہے۔ خدا کے فرشتے ہر لمحہ اس ٹسٹ کی رپورٹ تیار کر رہے ہیں۔ اسی رپورٹ پر اگلے مرحلۂ حیات میں آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور پھر کسی کو جنت میں داخلہ ملے گا اور کسی کو جہنم میں۔

یہ ٹسٹ کیا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں جن احوال سے دوچار ہوتا ہے ان میں وہ کیا رسپانس دیتا ہے۔ ایک قسم کا رسپانس آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے اور دوسری قسم کا رسپانس اس کو جہنم والوں کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔

اصولی اعتبار سے اس رسپانس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو ربانی رسپانس کہا جاسکتا ہے اور دوسرے کو شیطانی رسپانس۔ ربانی رسپانس یہ ہے کہ آدمی جب کسی صورت حال سے دوچار ہو تو وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس معاملہ میں خدا کی مرضی کیا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کو غصہ دلا دیا تو آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ غصہ کا جواب غصہ سے دینا اللہ کو پسند ہے یا غصہ کا جواب معافی سے دینا۔ اسی طرح اتفاقی اسباب سے کسی کا مال آپ کے قبضہ میں آگیا تو آپ کو سنجیدگی کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ ایسا مال مجھے اپنے پاس رکھنا چاہیئے یا اس کو اصل مالک کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔

اسی طرح ایک صورت حال سامنے آتی ہے جب کہ جھوٹ بول کر مقبولیت ملتی ہے اور سچ بولنے سے آدمی کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی محبوبیت کھودے گا۔ ایسے موقع پر چاہیئے کہ آدمی کھلے ذہن کے ساتھ معلوم کرے کہ دونوں میں سے کون سا رسپانس خدا کو اس سے مطلوب ہے اور پھر اس کو اختیار کرلے۔

آدمی ہر لمحہ مختلف احوال سے دوچار ہوتا ہے۔ صبح وشام اس کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ احوال و معاملات سب کے سب امتحان کے پرچے ہیں۔ آدمی کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ ان پرچوں کو کس طرح حل کرتا ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی ذاتی خواہش پر چلے۔ وہ صرف اپنے ذاتی فائدے کو دیکھے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو اختیار کرے۔ ایسا آدمی اپنے امتحانی پرچے کو حل کرنے میں ناکام ہو گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کرے۔ وہ قرآن وحدیث میں اس کا مسئلہ تلاش کرے۔ اور پھر خدا کی کتاب اور رسول کی سنت سے جو حکم ملے اس کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرلے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

موجودہ دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا نہ انعام کے لئے ہے اور نہ سزا کے لئے۔ بلکہ دونوں ہی آزمائش کے لئے ہیں۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملہ کو اسی نظر سے دیکھے۔ جب اس کو کوئی چیز ملے تو وہ خدائی قانون کے مطابق اس کا حق ادا کرے۔ اور جب کوئی چیز اس سے چھینی جائے تب بھی وہ وہی کرے جو خدائی قانون میں ایسے موقع پر کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

برائی کے بعد

واقمم الصلاۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیات ذلك ذكرى للذاكرين (ھود ۱۱٤) اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لئے۔

آدمی اپنی فطری کمزوریوں کی بنا پر طرح طرح کی کوتاہیاں کرتا ہے۔ بعض اوقات اس سے کوئی بڑا گناہ بھی سرزد ہو جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی کا ضمیر فوراً اس کو ملامت کرتا ہے۔ اس طرح ضمیر گویا اس بات کا پیشگی اعلان ہے کہ تم یہ غلطی کر کے اللہ کی نظر میں مجرم بن گئے ہو۔ موجودہ حالت میں تم اللہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

اب انسان کیا کرے مذکورہ آیت اسی سوال کا جواب ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ برائی کے بعد نیکی کرنے کی کوشش کرے۔ یہ نیکی گویا اس کی طرف سے برائیوں کی تلافی ہے۔ یہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو دوبارہ مقبول بنانے کی کوشش ہے۔

جب آدمی کوئی برائی کرتا ہے تو ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ نیکی کے بارے میں اس کا جذبہ کمزور پڑ گیا تھا۔ وہ برائی کرنے اور نیکی کے بارے میں اپنی حساسیت کھو بیٹھا تھا۔ اس کے اندر سے وہ مزاج رخصت ہو گیا تھا جو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اذا سرتک حسنتک وسائتک سیئتک فانت مؤمن (مشکاۃ المصابیح ۱ر ۲۰) یعنی جب نیکی کر کے تم کو خوشی ہو اور برائی کر کے تم کو دکھ ہو تو سمجھ لو کہ تم مؤمن ہو۔

برائی کے بعد نیکی کرنا نیکی کے بارے میں اپنی حساسیت کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ یہ برائی کے میل کو نیکی کے پانی سے دھو کر اس کو صاف کر دینا ہے۔

منصفانہ رویہ

قرآن (المائدہ ۸) کے مطابق، اللہ پر ایمان لانے والے ہر شخص کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے قول اور اپنے فعل کو منصفانہ بنانے کا پورا اہتمام کرے، گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہر جگہ وہ عدل کی روش پر قائم رہے۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ دوسروں سے اس کو شکایت پہنچی ہو، جب کہ دوسروں نے اس کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا ہو۔

اس آیت کا دوسرا پہلو وہ ہے جو داعی اور دعوت سے تعلق رکھتا ہے۔ حق کا داعی جب کسی ماحول میں دعوت کا کام شروع کرتا ہے تو وہ ایک بگڑا ہوا ماحول ہوتا ہے۔ اگر لوگ بگڑے ہوئے نہ ہوں تو دعوتی کام کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ زیادتی کر کے داعی گروہ کے حقوق چھین لیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ سیاسی غلبہ حاصل کر کے داعی گروہ کو مغلوبیت کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے حق سے زیادہ لے لیتا ہے اور داعی گروہ کو اپنے حق سے کم پر راضی ہونے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں داعی گروہ سخت نازک حالات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب اگر داعی گروہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو ایسا ہوگا کہ داعی گروہ کے دل میں مدعو گروہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس کا لٹریچر مدعو گروہ کی ظالمانہ داستانوں سے بھر جائے گا۔ اس کی مجلسوں سے لے کر اس کی صحافت اور ادب تک ہر جگہ مدعو گروہ کی زیادتیوں کا چرچا ہونے لگے گا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ داعی گروہ اور مدعو گروہ کے درمیان وہ معتدل فضا ہی ختم ہو جائے گی جو دعوتی عمل کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

اشاعت فاحشہ

قرآن (النور ۱۹) میں اشاعت فاحشہ کو سخت جرم بتایا گیا ہے۔ اشاعت فاحشہ کا مطلب ہے برائیوں کا چرچا۔ یعنی آدمی کا مزاج یہ ہو جائے کہ وہ دوسروں میں کوئی بھلائی دیکھے تو لوگوں کے درمیان اس کا چرچا نہ کرے۔ لیکن اگر کسی کے بارے میں صحیح یا غلط طور پر کوئی بری بات اس کے علم میں آجائے تو فوراً اس کو ہر ایک سے بیان کرنے لگے، وہ اس کو پورے معاشرے میں پھیلا دے۔ یہاں تک کہ وہ شخص اتنا زیادہ بدنام ہو جائے کہ اس کے بارے میں لوگ کوئی اچھی بات سنیں تو یقین نہ کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی منافقانہ معاشرہ کی پہچان کیا ہے۔ کسی معاشرہ میں اگر ایسا ہو کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے بارے میں انتخابی رپورٹنگ (selective reporting) کرنے لگیں۔ یعنی کسی آدمی میں اگر ۹۹ بات اچھی ہو تو وہ اس کا چرچا نہ کریں۔ البتہ اگر اس کے بارے میں کوئی ایک بری بات معلوم ہو جائے تو وہ فوراً اس کی اشاعت شروع کر دیں۔ انہیں کسی کے بارے میں تعریفی بات کہنا اچھا نہ لگے، البتہ بری بات کہنا ان کے لئے محبوب ہو جائے۔ جس معاشرے کے افراد کا یہ حال ہو وہ معاشرہ بلاشبہ منافقوں کا معاشرہ ہے، وہ مخلص انسانوں کا معاشرہ نہیں۔

کسی معاشرہ میں جب یہ مزاج عام ہو جاتا ہے تو وہ انفرادی نفاق پر نہیں رکتا۔ اب نفاق ہی اس کے تمام اداروں کا عام کردار بن جاتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں مجلسوں میں ہونے والی گفتگوئیں، جلسوں میں ہونے والی تقریریں، حتی کہ اخباروں میں چھپنے والی خبریں، ہر ایک کا انداز یہی ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرہ کی ہر سرگرمی نفاق کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ ایسے معاشرہ کے مذہب کو، ایک لفظ میں نفاق کلچر کہا جا سکتا ہے۔

ظالم انسان

پانی اس مقام سے اندر داخل ہو جاتا ہے جہاں سوراخ ہو۔ ٹھیک اسی طرح ظالم انسان عین اس مقام سے آپ پر حملہ کرتا ہے جو آپ کا نازک مقام (vulnerable point) ہو۔ پانی کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لئے سوراخ کو بند کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آپ کو چاہئے کہ اپنے نازک مقام کی نگرانی کرتے رہیں تاکہ ظالم لوگوں کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ آپ کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا سکیں۔

یہ صورت حال امتحانی آزادی کی بنا پر ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے آپ اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ اپنے معاملات کو ایسی محتاط صورت میں انجام دیں کہ کسی ظالم کو آپ پر ظلم کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

ظالم سے اس قسم کا تحفظ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ہر ایک کے بس میں ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو سرگرم رکھے اور جو معاملہ کرے اس کے تمام پہلوؤں کو پیشگی طور پر سمجھ لے۔ اس سلسلہ میں مشورہ نہایت مفید چیز ہے۔ اگر آدمی کے اندر مشورہ کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو تو مشورہ ہی اس معاملہ میں اس کے تحفظ کے لئے کافی ہو جائے گا۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ آج پیش آیا ہے وہ اس سے پہلے ہزاروں لوگوں کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ ماضی اور حال کے لوگوں میں وہ تجربات بار بار دہرائے جا چکے ہیں جس سے آپ آج دوچار ہو رہے ہیں۔ اس لئے اگر آپ اپنی آنکھوں کو کھلا رکھیں تو آپ جان لیں گے کہ کسی معاملہ میں ایک غلطی کر کے آپ جس ناخوشگوار

تجربہ سے دوچار ہونے والے ہیں عین اسی قسم کی غلطی کی ایک مثال کسی اور شخص کی زندگی میں پہلے سے موجود ہے۔

دوسروں کے تجربات آپ کے لئے بہترین رہنما ہیں۔ اگر آپ دوسروں کے تجربات سے سبق لینا سیکھ لیں تو یہ بات آپ کے لئے اس کی ضمانت بن جائے گی کہ آپ کو ان نقصانات سے دوچار ہونا نہ پڑے جس سے دوسرے لوگ اپنی کسی غلطی کی بنا پر دوچار ہوئے۔

قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا پر اعتماد و توکل کرو۔ دوسری طرف قرآن میں یہ بھی حکم ہے کہ تم لوگ اپنے بچاؤ کا انتظام رکھو۔ (النساء ۷۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اگرچہ تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ ہر چیز مکمل طور پر اسی کے قبضہ میں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا خدا نے امتحان کے لئے بنائی ہے۔ اس امتحانی مصلحت کی بنا پر خود خدا نے ہر عورت اور مرد کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہ آزادی بالکل ضروری تھی۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر امتحان کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی امتحانی آزادی کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہر آدمی کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اب اگر لوگوں سے ان کی آزادی چھینی جائے تو امتحان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ خدا پر توکل کرتے ہوئے شریر لوگوں سے اپنے بچاؤ کا انتظام بھی ضرور رکھیں۔

اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو توکل اور بچاؤ کے اس دو طرفہ تقاضے کی رعایت کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔

ڈرواس سے جو وقت ہے آنے والا

قرآن میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ان کا نام ہابیل اور قابیل تھا۔ قابیل ایک بات پر ہابیل سے غصہ ہو گیا۔اس کے دل میں اپنے بھائی کے خلاف حسد اور بغض پیدا ہو گیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ قابیل ایک روز ہابیل کو جان سے مارنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ہابیل ایک مخلص اور پاک باز انسان تھا۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس نے اپنے بھائی قابیل سے کہا کہ :اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لئے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی لے لے پھر تو آگ والوں میں شامل ہو جائے۔اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی۔(المائدہ۔۲۸۔۲۹)

یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ.....کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ دینار۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز اور روزہ اور زکاۃ کے ساتھ آئے۔اسی کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہو کسی پر الزام لگایا ہو اور کسی کا مال کھایا ہو،اور کسی کا خون بہایا ہو اور کسی کو مارا ہو۔تو اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی۔پھر اگر معاملہ برابر ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو مظلوموں کے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے۔پھر اس کو آگ میں پھینک دیا جائے گا۔(مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۱۸)

یہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے جس سے آدمی کو ڈرنا چاہیئے۔موجودہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔اس لئے یہاں ہر انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جو چاہے

کرے۔ اس آزادی کی بنا پر آدمی اکثر بے خوف ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہاں زیادتی کرنے والے کا ہاتھ فوراً پکڑا نہیں جاتا، اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں، میرے لئے خطرہ کی کوئی بات نہیں۔

مگر یہ ایک انتہائی بھیانک بھول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے کسی عمل کا جو سخت انجام انسان کے سامنے آنے والا ہے، اگر وہ اس کو پیشگی طور پر جان لے تو وہ بولنے کے بجائے خاموشی کو پسند کرے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح رک جائیں جیسے کہ ان میں جان ہی نہیں۔

قرآن و حدیث کے مذکورہ بیان کے مطابق، آج کی دنیا میں اگر کوئی شخص کسی آدمی کے خلاف زیادتی کرے، مثلاً وہ اس پر جھوٹا الزام لگائے، وہ اس کے مال و جائداد پر ناحق قبضہ کرلے، وہ اس کی آبروریزی کرے، یا اور کسی قسم کی زیادتی کرے تو یہ معاملہ اسی دنیا میں ختم ہو جانے والا نہیں۔

موت کے بعد جب تمام لوگ قیامت میں اکھٹا کئے جائیں گے تو وہاں ظالم اور مظلوم کا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ وہاں ہر آدمی مجبور ہوگا کہ بے بسی کے ساتھ اپنے خلاف فیصلہ کو مان لے۔ خدا کے حکم کے مطابق اس وقت ایسا کیا جائے گا کہ ظالم کے اچھے اعمال اس سے لے کر مظلوم کے خانہ میں ڈال دیئے جائیں گے اور اگر ظالم کے پاس نیکیاں کم ہوں تو مظلوم کی برائیوں کو ظالم کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد ظالم کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا تاکہ وہ ابد تک اپنے کئے کی سزا بھگتتا رہے۔

آدمی اگر اپنے قول و عمل کے اس بھیانک انجام کو سوچے جو کل سامنے آنے والا ہے تو اچانک اس کی پوری زندگی بدل جائے گی۔

سائنسی مزاج

۲؍جون ۱۹۹۸ کو دوردرشن (نئی دہلی) میں ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس میں چھ آدمی تھے۔ میرے سوا ایک مرکزی وزیر، ایک سوشل ایکٹوسٹ، ایک پروفیسر، ایک انگریزی جرنلسٹ اور ایک تعلیم یافتہ خاتون۔ اس کا موضوع سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) تھا۔

میں نے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۷ میں کہا تھا کہ ہمارے دیش کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) ہے۔ مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی لوگوں میں سائنٹفک ٹمپر پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس رخ پر ایجوکیٹ نہیں کیا گیا۔

میں نے کہا کہ سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ سائنٹفک ٹمپر سے کیا مراد ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس سے مراد حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر (realistic approach) ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک دعا ہے۔ اس دعا میں آپ نے جن چیزوں کو خدا سے مانگا ان میں سے ایک یہ تھی: اللھم ارنا الاشیاء کما ہی (اے خدا، ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں) اس کے مطابق، سائنسی مزاج یا سائنسی سوچ کا مطلب ہے: جیسا ہے ویسا سوچنا (as it is thinking)

اس قسم کی سائنسی سوچ زندگی کے لئے بے حد اہم ہے، ایک فرد کے لئے بھی اور پوری قوم کے لئے بھی۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ہم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے، اس کے اپنے قوانین ہیں۔ وہ خود اپنے اٹل اصولوں پر چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ اپنے آس پاس کی دنیا کو کھلے ذہن کے تحت دیکھا جائے۔ فطرت کے

قانون کو اس کی اصل صورت میں سمجھا جائے۔ اسی سے وہ چیز پیدا ہو سکتی ہے جس کو حقیقت پسندانہ سوچ کہا جائے۔ اس سے آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ چیزوں کے بارے میں وہی رائے قائم کرے جو کہ بطور واقعہ ہونا چاہیئے۔ اسی کا نام سائنسی مزاج ہے، اور وہی لوگ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں جن کے اندر اس قسم کا مزاج پایا جاتا ہو۔

سائنسی سوچ دراصل اس سوچ کا نام ہے جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔ اس کا تعلق مادی دنیا سے بھی ہے اور انسانی دنیا سے بھی۔ مثال کے طور پر آپ کو ایک دریا کے اوپر پل بنانا ہے۔ اب سائنسی طریقہ یہ ہوگا کہ آپ موم کے ذریعہ اپنا یہ پل نہ بنائیں، بلکہ لوہے کے ذریعہ بنائیں۔ اسی طرح آپ کو غلہ کی فصل اگانی ہے تو آپ غلہ کا بیج زمین میں ڈالیں نہ کہ پتھر یا پلاسٹک کے ٹکڑے اپنے کھیت میں بکھیر دیں۔

یہی معاملہ انسانی دنیا کا بھی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی کوئی نتیجہ اس وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب کہ اس میں متعلقہ حقائق کی پوری رعایت کی گئی ہو۔ بصورت دیگر ظاہری کوشش کے باوجود مطلوب نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

آپ کسی کو اپنا حامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضمیر کو متحرک کرنا ہوگا۔ اگر آپ اس کی انا کو چوٹ پہنچائیں تو وہ برعکس طور پر آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اگر آپ دوسروں سے کچھ پانا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ دوسروں کی نظر میں آپ دینے والے بن جائیں، کیونکہ لوگ اسی کو دیتے ہیں جس سے انہیں خود بھی مل رہا ہو۔ اگر آپ لوگوں کے درمیان عزت کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تواضع کی روش اختیار کرنی پڑے گی۔ کیونکہ عزت کا مقام تواضع کرنے والے کو ملتا ہے نہ کہ گھمنڈ کرنے والے کو۔

۷ ستمبر کو دوبارہ مذکورہ ہندو صاحبان دو اور صاحبان کو لے کر آئے۔ یہ ڈاکٹر امت باروٹ (Tel. 757-5382108) اور مسٹر جینت باروٹ (Tel. 757-4830370) تھے۔ ان لوگوں سے دیر تک بات ہوتی رہی۔ یہ سب سوادھیائے تحریک سے جڑے ہوئے لوگ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پورے امریکہ میں سوادھیائے کے ۳۰۰ سنٹر (کیندر) ہیں۔

ڈاکٹر نجم اختر صاحب امریکہ میں اپنا موجودہ کام چھوڑ کر سعودی عرب کی ایک یونی ورسٹی میں جا رہے ہیں۔ وہاں وہ ٹیچنگ جاب کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ سعودی عرب کے مقابلہ میں امریکہ کی تنخواہ ڈھائی گنا زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے جب یہاں کا کام چھوڑنے کے لیے کہا تو کمپنی کے یہودی چیرمین نے انھیں پیش کش کی کہ ہم تمہاری سالانہ تنخواہ میں پانچ ہزار ڈالر زیادہ کر دیں گے، تم یہاں سے مت جاؤ۔

پھر ڈاکٹر نجم اختر صاحب کیوں یہاں سے جا رہے ہیں۔ اس کا دو سبب ہے۔ ایک بچوں کا مسئلہ۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں کے آزاد ماحول میں ان کے بچے خراب ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ کا جذبہ بہت قابل قدر ہے، مگر اس کا تعلق نقل مکانی سے نہیں۔ آپ اپنی اگلی نسل کو اس سے روک نہیں سکتے۔ بڑے ہونے کے بعد آپ کے بیٹے اور پوتے دوبارہ یہیں آئیں گے، جیسا کہ دوسروں کے بیٹے اور پوتے کر رہے ہیں۔

دوسری بات ان کے ذہن میں یہ ہے کہ امریکہ میں اپنی صلاحیتوں کو میں "دشمن" کے حق میں مفید بنا رہا ہوں۔ یہاں اور بھی بہت سے نیک دل مسلمان ہیں جو اس طرح سوچتے ہیں اور اس بنا پر یہاں سے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے اس طرز فکر سے اتفاق نہیں۔ اس طرز فکر کا سبب یہ ہے کہ یہ مسلمان ان "اغیار" کو دشمن اسلام کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ خود یہ طرز فکر اسلام کے حق میں سب سے بڑی دشمن ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کو مدعو سمجھیں اور ان سے مدعو والا معاملہ کریں۔

اگر مذکورہ فکر کو اختیار کیا جائے تو کبھی بھی دعوت کا عمل شروع نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ برتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ وہ داعی کا استحصال کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے دعوت کا عمل صرف اس وقت شروع ہوگا جب کہ معاملہ کو اس ذہن سے نہ دیکھا جائے۔

تاتاریوں نے ہزاروں مسلمانوں کو پکڑ کر اپنا خادم بنالیا۔ یہی غلام اور خادم تھے جنھوں نے خاموش تبلیغ کے ذریعہ تاتاریوں کو مسلمان بنا دیا۔ یہ مسلمان اگر سوچتے کہ میں اپنے آپ کو ان دشمنوں کی خدمت میں کیوں لگاؤں تو تاتاریوں کے درمیان دعوت کا عمل شروع ہی نہ ہوتا اور اسلام کی تاریخ کا وہ شاندار باب کبھی نہ لکھا جاتا جس کو اقبال نے اس طرح نظم کیا ہے :

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانہ سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان یہاں دعوتی مقصد کے تحت رہیں، اور بقیہ چیزوں کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیں۔

ماونٹ ہالی کے سنٹر کی پشت پر بہت دور تک کھلا ہوا سرسبز میدان ہے۔ سنٹر کا ایک دروازہ اس کی طرف کھلتا ہے۔ ۶ ستمبر کی صبح کو میں نے یہ دروازہ کھولنا چاہا تو وہ غیر مقفل تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں اسی طرح دوسرے دروازے بھی غیر مقفل پڑے رہتے ہیں۔ یہاں چوری وغیرہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جب کہ اس سے پہلے جب میں نیویارک میں تھا تو وہاں دروازہ کو پوری طرح بند رکھنا پڑتا تھا، کیونکہ وہاں چوری کا بھی اندیشہ رہتا ہے اور تشدد کا بھی۔

اب اگر کوئی شخص صرف نیویارک کی ایک خبر لے کر اس کو جنرلائز کرے تو وہ کہے گا کہ امریکہ جرائم کا ملک ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ماونٹ ہالی کی مثال لے کر اس کو جنرلائز کرے تو وہ امریکہ کی بالکل دوسری تصویر پیش کرے گا جس میں امریکہ اسلام کی اخلاقی قدروں کا حامل دکھائی دینے لگے گا۔

تاریخ کی اکثر غلطیاں اسی قسم کے غلط جنرلائزیشن کے نتیجہ میں پیش آئی ہیں۔ لوگ صورت حال کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہیں کرتے۔ ان کے سامنے پوری تصویر کا کوئی ایک پہلو آتا ہے۔ اسی ایک پہلو کو وہ کل پہلو سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بارہ میں ایک کلی بیان دے دیتے ہیں۔ اس قسم کا بیان ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ جنرلائزیشن کی یہ غلطی اسلامی تاریخ یا مسلم سماج کے بارہ میں بھی کی جاتی ہے اور دوسروں کے بارہ میں بھی۔

۶ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ مجھ سے خطبہ کے لیے اور نماز پڑھانے کے لیے کہا گیا۔ میں نے اس سے معذرت کی۔ البتہ خطبہ سے پہلے ۲۰ منٹ کی ایک تقریر کی۔ پہلے ۱۰ منٹ تک

انگریزی میں اور اس کے بعد ۱۰ منٹ اردو میں۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ صحابہ کی بہت کم قبریں پائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ اسلام کا پیغام لے کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ چنانچہ ان کی قبریں بھی زیادہ تر باہر ہیں۔ حضرت عبادہ بن ثابت کی اہلیہ کی قبر قبرص میں ہے۔ حضرت خالد کی قبر حمص میں۔ حضرت معاذ بن جبل کی قبر اردن میں، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ دوبارہ مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر امریکہ میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں آ گئے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ ابتداءً معاش کے جذبہ کے تحت آئے تھے۔ مگر حالات نے انھیں بتایا کہ تمہیں اسلام کی نمایندگی کرنا ہے، ورنہ تم اپنا وجود کھو دو گے۔ چنانچہ آج یہ مسلمان تمام مغربی دنیا میں کثرت سے مسجد اور اسلامی مرکز اور دینی ادارے بنا رہے ہیں۔ بے شمار تعداد میں اسلامی لٹریچر لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کا وجود بذاتِ خود یہاں اسلام کو موضوع بحث بنا دیتا ہے۔

یہاں ایک مسلمان ڈاکٹر کا حال معلوم ہوا۔ وہ اپنے فن میں نہایت ماہر ہیں۔ انھوں نے یہاں تقریباً ایک بلین ڈالر کمایا۔ شاندار مکان بنایا۔ بچوں کو نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ مگر اب ان کا جھگڑا خود اپنے بیوی بچوں سے ہو گیا ہے۔ بیوی بچے ایک طرف ہیں اور وہ دوسری طرف۔ زندگی سخت پریشانیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ ذیابیطس اور دوسری بیماریاں بھی انھیں لاحق ہو گئی ہیں۔ شاندار مکان، شاندار کاریں اور شاندار بزنس، کسی چیز میں اب ان کے لیے سکون باقی نہیں رہا۔ جھگڑے کا آغاز یہاں سے ہوا کہ ان کے مطب میں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ بیوی کو اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب پر شبہ ہو گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے آخری حد پر پہنچ گئی۔

اس طرح کے واقعات یہاں بہت زیادہ ہیں۔ امریکہ ایک طرف دولت کی کثرت کی جگہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کی بھی ایک عبرت ناک مثال ہے کہ مادی فراوانی کبھی کسی کو سکون نہیں دیتی۔

۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز (ماونٹ ہالی) میں نماز فجر کے بعد مجھ سے درس کے لیے کہا گیا۔

حاضرین میں زیادہ تر انگریزی جاننے والے تھے۔ اس رعایت سے میں نے انگریزی میں حدیث کا درس دیا۔ یہ درس اس حدیث پر مبنی تھا: من صلی الصبح فهو فی ذمة الله (جس نے صبح کی نماز ادا کی وہ اللہ کی گارنٹی میں آگیا)

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز مصلیوں کے اندر ایسے انسانی اوصاف پیدا کرتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ دوسروں کی طرف سے مامون و محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان صفات کو چار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے —— تواضع، شکر، اطاعت، اسلامی، ڈسپلن:

modesty, thanksgiving, submission, peace, discipline.

ابتدائی چار صفات انفرادی اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ پانچویں صفت اجتماعی صفت ہے اور وہ نماز باجماعت کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

مولانا ذکی الدین شرفی یہاں مسلسل طور پر مختلف قسم کے اسلامی پروگرام چلا رہے ہیں۔ ۸ ستمبر کو جناب فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر ہفتہ وار پروگرام تھا۔ صبح سویرے روانہ ہو کر ہم لوگ فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہاں اور بھی کئی لوگ اکھٹا تھے۔ ان کے مکان کے بیسمنٹ میں فجر کی نماز ادا کی گئی۔ مولانا ذکی الدین صاحب کی موثر قرأت نے اس کو بہت پُرتاثیر بنا دیا۔ نماز کے بعد مولانا ذکی الدین شرفی نے قرآن کا درس دیا۔

آخر میں میں نے یہ حدیث پڑھی: ذاق طعم الایمان من رضی بالله ربًّا وبمحمد رسولًا وبالاسلام دینًا۔ میں نے کہا کہ ایمان اور اسلام کا ایک فارم ہے اور دوسری چیز اس کی روح اور اسپرٹ ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے ایک پھل میں چھلکا اور مغز ہوتا ہے۔ ذائقہ والی دین داری آدمی کو اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ فارم سے گزر کر روح اور اسپرٹ تک پہنچ جائے۔ اللہ کا نام لینا ایک ظاہری اعتبار سے ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب آپ اللہ کا نام لیں تو اللہ کی صفات کمال کو یاد کر کے آپ کا سینہ لرز اٹھے۔ اس کا نام پر ذائقہ ایمان ہے۔ نماز کی ایک ظاہری ادائگی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نماز ادا کرتے ہوئے آپ کی پوری شخصیت خشوع اور تواضع کے احساسات میں ڈھل جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائگی کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ حساب کر کے مقرر رقم کسی کو دے دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب آپ رقم دے رہے ہوں تو آپ الذین

یوتون ما آتو وقلوبھم وجلۃ کی تصویر بنا ہوا ہو۔ یہی معاملہ تمام اسلامی اعمال کا ہے۔

پروگرام کے بعد ناشتہ کی مجلس میں ہالینڈ سے آئے ہوئے ایک صاحب نے بتایا کہ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی ہالینڈ کے شہر لائیڈن میں پہلی بار اٹھارویں صدی میں چھاپی گئی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ڈچ لوگوں نے جب یہ منصوبہ بنایا کہ مسلم قوموں کو غلام بنائیں تو انھوں نے اپنے غلاموں کے مزاج اور مذہب کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے کام کیے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا کام مغربی ملکوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر کیا ہے۔ مگر ان کو سازش وغیرہ سمجھنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کو اس حدیث کا مصداق قرار دیا جائے۔ ان اللہ لیؤید ھذا الدین بر جل فاجر (اللہ اس دین کی تائید برے آدمی کے ذریعہ بھی کرے گا)

۷ ستمبر کی شام کو ہم لوگ اسلامک سوسائٹی، سنٹرل جرسی پہنچے۔ یہاں عصر اور مغرب کے درمیان میرا خطاب رکھا گیا تھا۔ یہ کافی وسیع اور شاندار مرکز ہے۔ اس میں مسجد کے علاوہ کئی شعبے ہیں۔ حاضرین میں بیشتر غیر اردو داں تھے۔ اس لیے یہاں مجھ کو انگریزی میں خطاب کرنا پڑا۔

میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا واحد حل دعوہ ورک ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی حیثیت آئیڈیالوجیکل سپریاورکی ہے۔ اسلام کو بطور دعوت پیش کرنا ہی اس وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ مگر ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور دعوت کی بھی ایک قیمت ہے۔ یہ قیمت مدعو سے یک طرفہ محبت ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلام کی دعوتی قوت کو استعمال کریں تو آپ کو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا مدعو کوئی استثنائی طور پر ظالم نہیں ہے۔ مدعو سے ہمیشہ ہی داعی کو ظلم و زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم ضروری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دعوت کا کام کرو تو تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ گویا کہ ہر دشمن امکانی طور پر ہمارا دوست ہے۔ مگر یہ دشمن اس وقت دوست بنتا ہے جب کہ اس کی زیادتی کے باوجود اس کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے اس عمل کی مثالیں بیان کیں۔

سنٹرل جرسی کی اسلامک سوسائٹی میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں کئی عرب بھی تھے۔ یہ ادارہ ۱۹۸۴ میں قائم ہوا۔ اس کے سابق صدر سے میں نے پوچھا کہ کیا اس کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ پیش آئی، انھوں نے کہا کہ کوئی رکاوٹ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکی پڑوسیوں سے ہمارا رشتہ اچھا ہو۔ پولیس سے بہتر تعلق ہو اور دوسرے اداروں کو ہم نے شکایت کا موقع نہ دیا تو یہاں کبھی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی، یہ بات جناب محمد عبدالحمید صدیقی نے بتائی۔ وہ ۱۹۷۱ سے امریکہ میں ہیں۔ اور اسلامک سوسائٹی، سنٹرل جرسی کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔

نیو جرسی ایک اسٹیٹ ہے، جس کا ایک حصہ جرسی ہے۔ یہ علاقہ بہت زیادہ سرسبز ہے۔ ہر طرف باغات اور زرعی فارم پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کو گارڈن اسٹیٹ بھی کہا جاتا ہے۔

۸ ستمبر کی شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ماونٹ ہالی کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں زیادہ تر عورتیں شریک تھیں۔ اس میں خطاب کا موضوع تھا کہ امریکی معاشرہ میں بچوں کا اسلامی تحفظ۔ اس پر بولتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا:

میں نے کہا کہ اگلی نسل کا اسلامی تحفظ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ آپ ایک مولوی صاحب کو مقرر کر دیں جو روزانہ شام کو آکر "دینیات" پڑھا دیں۔ یا کوئی دینی رسالہ آپ اپنے بچوں کے نام جاری کر دیں۔ یا انھیں کلچرل نوعیت کی کچھ چیزوں کا عادی بنانے کی کوشش کریں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اگر آپ کو اپنے بچوں کو اسلامائز کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنے گھر کو اسلامائز کیجئے۔ آپ کے گھر میں دنیا کا چرچا نہ ہو بلکہ دین کا چرچا ہو۔ گھر کا ماحول مادی رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو بلکہ آخرت کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

دوسری بات یہ کہ آپ اپنے بچوں کے اندر داعیانہ اسپرٹ پیدا کریں۔ یہ ایک اصول ہے کہ جو داعی نہیں بنتا اس کو مدعو بننا پڑتا ہے۔ اس لیے اگر آپ نے اپنے بچوں کے اندر داعیانہ اسپرٹ نہیں پیدا کی تو وہ دوسروں سے متاثر ہو کر رہیں گے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کا قانون کبھی نہیں بدلتا۔

تیسری چیز یہ کہ یہاں ہر بچہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ بچہ کو اردو یا عربی زبان بھی ضرور پڑھائی جائے، تاکہ وہ اسلامی لٹریچر

سے استفادہ کے قابل ہو سکے۔ انگریزی میں بقدر ضرورت لٹریچر موجود نہیں ہے۔ اس لیے صرف انگریزی زبان کافی نہیں ہو سکتی۔

بعد کو ایک صاحب ملے اور انھوں نے ایک سوال کیا۔ میں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ایک شخص اپنے بچہ کو ڈاکٹری نہ پڑھائے۔ اور جب وہ بڑا ہو جائے تو بلیک مارکٹ سے ڈاکٹری کا جعلی سرٹیفکیٹ خرید کر اس کو ڈاکٹر بنانا چاہے تو یہ کیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو پاگل پن ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارے اکثر سرپرستوں کا حال یہی ہے۔ وہ اپنے بچہ کو پہلے غیر جنتی راستہ پر چلائیں گے اس کے بعد چاہیں گے کہ کہیں سے جنت کا ٹکٹ حاصل کر کے اسے دے دیں۔ تو ایسا ٹکٹ صرف کسی خوش خیال آدمی کے ذہن میں ہو سکتا ہے۔ وہ حقیقی دنیا میں کبھی نہیں پایا جاتا۔

امریکی نو مسلم عبد الرحمٰن صاحب ۸ ستمبر کو عشاء کی نماز کے بعد ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے ان کو چند حدیثیں سنائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں ہر چیز کا انحصار نیت پر ہے۔ نیت اچھی ہو تو ہر چھوٹا یا بڑا کام ثواب بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک چیز آپ کو ہر وقت نہیں مل رہی ہے۔ آپ نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا تو وہ ثواب بن گیا۔ اسی طرح آپ کو کسی نے برا کہا۔ آپ کو غصہ آگیا۔ آپ نے اللہ کی خاطر صبر کر لیا تو پھر صبر کرنا عظیم ثواب بن گیا۔ اسی طرح ہر چیز میں نیت کا پہلو شامل ہے۔ اور ہر کام اچھی نیت کے ساتھ ثواب بن جاتا ہے۔

۸ ستمبر کی صبح کو ماونٹ ہالی میں الرسالہ مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دیر تک گفتگو ہوئی۔ آخر کار الرسالہ فورم انٹرنیشنل کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اجتماع میں جو باتیں طے کی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ الرسالہ لٹریچر کی ویب سائٹ (انٹرنیٹ) شروع کیا جائے۔ اس طرح الرسالہ مشن ان شاء اللہ ورلڈ وائڈ ویب (WWW) سے مربوط ہو جائے گا۔

اس کے تحت ان شاء اللہ الکٹرانک میل (ای میل) کے پتوں کی ایک عالمی فہرست بنائی جائے گی۔ تاکہ دنیا بھر میں ہر جگہ ای میل کے ذریعہ الرسالہ کا پیغام پہنچایا جا سکے۔ اس سلسلہ میں رابطہ کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے:

خواجہ کلیم الدین، نیویارک (Tel. 718-2583435)

اس پروگرام میں ایک فلسطینی نوجوان امام یحییٰ الھندی (Tel. 202-5439449) بھی تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور نہایت سنجیدہ بھی۔ انھوں نے کہا کہ اِسنا کی کانفرنس میں ایک اسٹال پر میں نے آپ کی انگریزی کتابیں دیکھیں۔ ان کا ٹائٹل (نام) مجھے بہت پسند آیا۔ اور میں نے تمام کتابیں خرید لیں۔

انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے میں ایک مسجد میں امام تھا۔ وہاں انتہا پسند عربوں کا غلبہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ نماز کے بعد یہ دعا کرو کہ اے خدا، امریکہ کو تباہ کر دے (O Allah, destroy America) مگر میں اس قسم کی دعا نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ وہاں اتنا اختلاف بڑھا کہ مجھے وہاں سے چھوڑ دینا پڑا۔

ڈاکٹر عرفان انیس عمر (ٹمپل یونی ورسٹی) بھی اس پروگرام میں شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں امریکی مسلمانوں کے اندر ایک بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ چند سال پہلے جب میں یہاں آیا اس وقت یہ حال تھا کہ امریکہ کا لفظ لوگوں کی زبانوں میں زہر گھول دیتا تھا۔ مگر آج وہ شدت ختم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اب لوگ حقیقت پسندی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اسلامی مرکز کے ذریعہ ۱۹۷۰ میں "حدیبیہ پرنسپل" کو اختیار کرنے کے نام پر جو فکری مہم شروع کی گئی تھی وہ آج نہ صرف انڈیا میں بلکہ امریکہ تک کے فکر کو متاثر کر رہی ہے اور اسی کے ساتھ ہر جگہ دعوت کے راستے کھل رہے ہیں۔ حدیبیہ پرنسپل کو ابتداءً لوگوں نے بزدلی اور پسپائی سے تعبیر کیا تھا۔ مگر آج ساری مسلم دنیا میں بلا اعلان یا اعلان کے ساتھ یہی فکر چھایا چلا جا رہا ہے۔ حدیبیہ پرنسپل دراصل نام ہے یک طرفہ طور پر مصالحانہ انداز اختیار کر کے داعی اور مدعو کے درمیان نارمل تعلق قائم کرنے کا، تاکہ دعوت کا عمل جاری ہو جائے۔ یہ عمل آج شروع ہو چکا ہے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ ایک صحیح عمل جب شروع ہو جائے تو وہ اپنے اختتام پر پہنچ کر رہتا ہے۔

امام یحییٰ نے بتایا کہ یہاں ایسے مسلمان ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ، تو امریکہ کو تباہ کر دے :

O Allah, destroy America.

میں نے امریکہ کے زمانۂ قیام میں یہاں کی ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ دوسری رکعت کے آخر میں امام صاحب نے ہاتھ اٹھا کر قنوت نازلہ پڑھی۔ اس میں انھوں نے کہا: اللّٰھُمَّ عَذِّبِ الکفرۃ والمشرکین الذین یصدون عن سبیلك ویقاتلون اولیاءك (اے اللہ، کافروں اور مشرکوں کو عذاب دے جو تیرے راستہ سے روکتے ہیں اور تیرے اولیاء سے جنگ کرتے ہیں)

ایک مسلم رہنما کے جلسہ میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے امریکہ کے خلاف پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ملک کے اندر آپ نہایت اچھا نظام دیکھیں گے۔ یہاں انھوں نے مکمل ڈیموکریسی قائم کر رکھی ہے۔ مگر یہی لوگ ہیں جو عراق میں بم گراتے ہیں۔ جو اپنے مفاد کی خاطر مسلم ملکوں کو لڑاتے ہیں۔ اپنے ملک کے اندر وہ جمہوری ہیں اور باہر کے ملکوں میں منافق:

Democracy at home, hippocracy abroad

مسلمانوں کی اکثریت اپنی زبان سے اسی قسم کی باتیں کرتی ہے۔ اس کے باوجود مولانا ذکی الدین شرفی کے بیان کے مطابق، تقریباً ۹ ملین مسلمان اپنے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا میں مسلم نوجوانوں کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ جائے۔ حالانکہ امریکہ کا شہری بننے کے لیے جو حلف لینا پڑتا ہے وہ روایتی اسلامی عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ ایک دین دار مسلمان جنھوں نے یہ حلف لے کر امریکی شہریت حاصل کی ہے، ان سے کہا گیا کہ ایسے غلط حلف پر کیوں آپ نے دستخط کیا۔ وہ بولے، میاں، میں نے جج کے سامنے ہاتھ تو ضرور اٹھا دیا تھا مگر میں اس وقت بھی اپنے دل میں اس پر لاحول پڑھ رہا تھا۔ مزید یہ کہ ایک صاحب کے بیان کے مطابق، یہاں آنے والے مسلمانوں میں بمشکل دو فی صد مسلمان ہیں جو یہاں کی مسجدوں یا اسلامی اداروں سے وابستہ ہیں۔ بقیہ ۹۸ فی صد مسلمان صرف اپنی دنیوی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ چند واقعات بتاتے ہیں کہ جو مسلمان امریکہ میں آکر آباد ہوئے ہیں، ان کی دینی اور اخلاقی حالت کیا ہے۔

۹ ستمبر کو مولانا ذکی الدین شرفی سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ماونٹ ہالی کے اسلامک سنٹر میں ہوئی۔ موضوع موجودہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ میں نے کہا کہ جہاں تک ہندستانی مسلمانوں کا تعلق ہے

ان کا اصل مسئلہ ہندو تعصب نہیں ہے بلکہ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی ہے۔ ہندستان میں جو مسائل تھے وہ صرف ہندستان کے لیے مخصوص نہیں تھے، وہ کسی ایک یا دوسری صورت میں ہر جگہ موجود تھے۔ یہ دراصل فطری چیلنج کا مسئلہ تھا نہ کہ کسی قوم کے تعصب یا ظلم کا مسئلہ۔ مگر نااہل مسلم لیڈروں نے ان مسائل کو ہندو تعصب کا مسئلہ بتایا، اور اس بنیاد پر علاحدگی کی دھواں دھار تحریک چلائی۔ انھیں اس بات کا شعور نہیں تھا کہ ہندو تعصب سے رہائی کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کا آخری مہلک انجام یہ ہونا ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد دوبارہ انھیں ہندوؤں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے۔

لیڈروں نے تو ہندستانی مسلمانوں کے معاملہ کو آخری حد تک بگاڑ دیا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کیے کہ دوبارہ مسلمانوں کا شعور صحیح رخ پر جاگنا شروع ہوا۔ اور اب خدا کے فضل سے ہندستان کے مسلمانوں نے تعمیر کے راستہ پر اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ ہندستانی مسلمان دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان بن جائیں گے۔

پاکستان کے ذیل میں میں نے کہا کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں نے اپنی پوری تحریک اس مفروضہ پر کھڑی کی کہ وہ مسلم لیگ کے پیدا کردہ مومنٹم کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں ایسا ممکن نہیں کہ مومنٹم کسی اور کے نام پر پیدا ہو اور کوئی دوسرا اسے استعمال کرے۔ مولانا ذکی الدین شرفی نے کہا کہ مگر جماعت اسلامی پاکستان کا تو دعویٰ ہے کہ یہ مومنٹم خود مولانا مودودی کا پیدا کیا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تقسیم کی پوری تحریک ہندو اکثریت کے خوف پر اٹھائی گئی تھی، جب کہ پاکستان کو حقیقی اسلامی نظام میں ڈھالنے کے لیے خدا کے خوف کا سرمایہ درکار تھا۔ اور یہ مزید اضافہ کے ساتھ ناممکن ہے کہ خوف ہندو پر برپا ہونے والی حرکت کو اچانک خوف خدا پر مبنی حرکت میں تبدیل کر دیا جائے۔

"انقلابی اسلام" کے ایک علم بردار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں پاکستان میں انقلاب لایا گیا۔ افغانستان میں اسلامی انقلاب لایا گیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب لایا گیا۔ مگر انقلاب کے باوجود کہیں اسلام نہ آسکا۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب تو ایک جاری عمل ہے۔

اسلامی انقلاب کا راز یہ ہے کہ وہ ہر دن اور ہر لمحہ زندہ رہتا ہے۔ انقلاب کے بعد بھی انقلاب جاری رہتا ہے :

The secret of the Islamic revolution is that it is lived everyday at every instant. After the revolution, the revolution continues.

میں نے کہا کہ کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا مستند نمونہ وہ انقلاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عرب میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر وہ انقلاب تو بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی انقلاب صحیح معنوں میں صرف فرسٹ جنریشن میں زندہ رہتا ہے۔ دوسری جنریشن اور تیسری جنریشن میں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اس پر زوال آنے لگتا ہے۔ پھر آپ کون سا نیا انقلاب لائیں گے جو تمام قوانین فطرت کے خلاف جاری عمل بن جائے۔ جو پہلی نسل کے بعد اگلی نسلوں میں مزید اضافہ کے ساتھ ترقی کرتا رہے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایک اجتماع میں مجھ سے کہا گیا کہ میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں کچھ بیان کروں۔ میں نے یہاں کے حالات پر کچھ باتیں کہیں۔ آخر میں سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو اقتصادی اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سب ان نام نہاد لیڈروں کی باتیں ہیں جو آپ کے پاس آکر مسلمانوں کی فرضی کہانیاں بتاتے ہیں تاکہ آپ انھیں تعاون کے نام پر بڑی بڑی رقمیں دیں۔

پھر میں نے کہا کہ آج کا ہندستانی مسلمان مکمل طور پر ایک بدلا ہوا مسلمان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے انھیں بتا رکھا تھا کہ انڈیا ان کے لیے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ مسلمانوں نے اسی فرضی وہم میں آزادی کے بعد چالیس سال کھو دیے۔ مگر اب خود حالات نے (نہ کہ رہنماؤں نے) انھیں بتایا کہ انڈیا میں ان کے لیے بھی اسی طرح مواقع ہیں جس طرح دوسروں کے لیے ہیں۔ چنانچہ آج کل انڈیا کے مسلمانوں میں زبردست اقتصادی سرگرمیاں جاری ہوگئی ہیں۔ آج آپ کسی بھی شہر یا بستی میں جاکر اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

ایک عالم رمضان کے زمانہ میں امریکہ آئے۔ افطار میں کھانا پینا ہو گیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا : افطر عندکم الصائمون اکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملائکۃ الاجبریل (آپ کے یہاں روزہ داروں نے افطار کیا۔ نیک لوگوں نے آپ کا کھانا کھایا۔ فرشتوں نے آپ کے

اوپر درود وسلام بھیجا سوا جبریل کے) لوگوں نے پوچھا کہ جبریل کیوں نہیں۔ عالم نے جواب دیا کہ چائے آنے تک وہ رکے ہوئے ہیں۔

اس قسم کے لطیفے لوگوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ مگر وہ میرے ذوق کے سراسر خلاف ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی ایک حد ہے اسی طرح لطیفہ کی بھی حد ہے۔ وہ یہ کہ لطیفہ کو عام انسانوں تک محدود رہنا ہے نہ کہ وہ فرشتوں جیسی مقدس ہستی تک جا پہنچے۔

ایک صاحب پاکستان سے آکر امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک امریکی نومسلمہ سے شادی کی۔ گھر میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی بات پر میری اور ان کی تکرار ہو جاتی اور ہم دونوں میں جھگڑا ہو جاتا۔ اس طرح گھر کے اندر سکون نہیں رہتا تھا۔ آخر کار مجھے آپ کا الرسالہ ملا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میرے گھر کی حالت بالکل درست ہو گئی۔

انھوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا "تین منٹ" اس میں ایک واقعہ لکھ کر بتایا گیا تھا کہ امن اور بے امنی کے درمیان صرف تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ جب کوئی شخص تلخ بات کہے اور آپ کے اندر اشتعال پیدا ہو جائے تو تین منٹ کے لیے وہاں سے ہٹ جائیے۔ اس کے بعد اپنے آپ دونوں کا دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا اور سکون کی حالت واپس آجائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے مواقع پر میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں اور اب میری گھریلو زندگی نہایت سکون کی زندگی ہے۔ اگر مجھے الرسالہ نہ ملتا تو شاید میرے یہاں طلاق کی نوبت آجاتی۔

امریکہ میں آپ جس مسلمان سے بھی ملیں، اس کی سب سے بڑی فکر اس کا بچہ ہوگا۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنی ایرکنڈیشنڈ کار میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ پھر وہاں اپنے ایرکنڈیشنڈ کمرہ میں بات کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ فکر ان بچوں کی ہے۔ آپ بتائیے کہ ان کی آخرت کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ آخرت کی کامیابی آخرت کے لیے مطلوب عمل کرنے سے ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدمی کی ساری توجہ دنیا پر لگی ہوئی ہو۔ اور اسی کے ساتھ اسے آخرت بھی تحفہ کے طور پر مل جائے۔ میں نے کہا کہ آپ نے حدیث میں پڑھا ہوگا کہ ان شدۃ الحر من فیح جہنم

(گرمی کی شدت جہنم کی سانس سے ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جہنم کے ابتدائی تجربات رکھے ہیں تاکہ آدمی ان سے گزر کر جہنم سے بچنے کی فکر کرے۔ مگر آپ لوگوں کی ساری کوشش یہ ہے کہ اپنے بچہ کو اس طرح رکھیں کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف کا تجربہ نہ ہونے پائے۔

یہ طریقہ خدا کی اسکیم کے خلاف ہے۔ خدائی اسکیم میں جنت کا راستہ جہنم کے تجربات سے ہو کر گزرتا ہے۔ اور آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو جنت کی ٹھنڈی ہواؤں سے گزارتے ہوئے جنت کے دروازہ میں داخل کر دیں۔

مولانا ذکی الدین شرفی ۱۹۸۹ میں آٹھویں سالانہ کانفرنس کے تحت تہران گئے۔ انھوں نے بتایا کہ شہر کی ایک مسجد میں وہ داخل ہوئے تو وہاں دیوار پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: یا خدا، تا ظہور مہدی منتظر نہضت خمینی را حفاظت بفرما (اے خدا، مہدی کی آمد تک خمینی انقلاب کی حفاظت فرما) مگر یہ دعا قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اس دنیا کا قانون ہے کہ کوئی بھی انقلاب یہاں اپنی ابتدائی صورت میں صرف پہلی جنریشن تک رہتا ہے۔ اس کے بعد لازماً اس کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ ایران کے انقلاب پسند صرف اپنے لیڈر کو جانتے تھے۔ اگر وہ قانون فطرت کو جانتے تو وہ مسجد میں اس قسم کے الفاظ نہ لکھتے۔ اس قسم کی دعا ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص بہار کا موسم پائے تو یہ دعا کرنے لگے کہ اے خدا، اب کبھی مجھے خزاں کو دیکھنا نہ پڑے۔

۹ ستمبر کو دوپہر کے کھانے پر کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کا ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ وہ چیزوں کو سفید و سیاہ میں دیکھ پاتے ہیں۔ حالانکہ یہ نظام فطرت کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کسی پہاڑی علاقہ میں جائیں تو وہاں بے شمار چشمے بہتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آپ وہاں کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ پائیں گے کہ بار بار پانی کے راستہ میں پتھر کے ٹکڑے آتے ہیں۔

اب پانی کے لیے بظاہر دو چوائس ہے۔ یا تو وہیں ٹھہر جائے۔ یا پتھر کو توڑ کر آگے جانے کی کوشش کرے۔ عام آدمی کہے گا کہ ایسی حالت میں ٹھہرنا تو پسپائی قبول کرنا ہے۔ اس لیے پانی کو چاہیے کہ وہ درمیانی پتھر کو توڑ کر اپنے لیے سیدھا راستہ بنائے۔ مگر پانی ایسا نہیں کرتا۔

وہ خدا کی دی ہوئی فطرت کے مطابق، دائیں اور بائیں سے راستہ نکال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

انسان کو بھی یہی فطری کورس اختیار کرنا ہے۔ اس کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ جب دورانِ سفر کوئی رکاوٹ آجائے تو وہ سمجھے کہ میرے لیے یا تو ٹکراؤ کی صورت ہے یا پسپائی کی صورت۔ اس کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ غور کرے تو عین وہیں اس کے لیے تیسری صورت موجود ہوگی جس کو اختیار کرکے وہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

کسی ملک کا کوئی آدمی اگر خصوصی لیاقت والا (exceptionally qualified) ہو اور وہ امریکہ آنا چاہے تو اس کو اس کے ملک کا امریکی سفارت خانہ فوراً ویزا دے دے گا۔ ایسے شخص کے لیے یہاں آکر کام کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہ امریکی نظام کی ایک طاقت ہے۔ اس کی وجہ سے امریکہ کو دنیا بھر کے بہترین دماغ حاصل ہوگئے ہیں۔ اس معاملہ میں یہ لوگ اتنے فراخ دل ہیں کہ بظاہر ایک دشمن ملک کا آدمی بھی اگر خصوصی لیاقت رکھتا ہے تو وہ بلا امتیاز یہاں اپنے لیے جگہ پا سکتا ہے۔ چنانچہ روس کے بہترین سائنس داں آج امریکہ میں آکر کام کر رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ یہودی پہلے زمانہ میں مسلسل حکومتوں کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ وہ کسی بھی ملک میں ترقی نہ کر سکے۔ مگر موجودہ زمانہ میں وہ ہر ملک میں، خاص طور پر امریکہ میں غیر معمولی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کا سبب کوئی نئی سازش نہیں ہے، بلکہ زمانہ کا فرق ہے۔ پچھلے زمانہ میں بادشاہی نظام ہوتا تھا۔ عام لوگوں کو آزادی حاصل نہ تھی۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی حکمراں کے دائرہ کو محدود کر دیا گیا ہے۔ آج ہر فرد اور ہر قوم کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہودیوں نے اس جدید امکان کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ اس طرح پچھلے زمانوں میں کامیاب نہ ہونے والے جدید دور میں کامیاب ہوگئے۔

میں نے کہا کہ یہودیوں کی جو صفات آج ہیں، وہی صفات ان میں پہلے بھی تھیں۔ مگر قدیم زمانہ کا سیاسی نظام انھیں موقع نہیں دیتا تھا۔ جب کہ جدید زمانہ کے سیاسی نظام نے انھیں موقع دے دیا۔

امریکہ میں انفرادی آزادی کو خیر مطلق کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی نہیں کر سکتے۔ اگر وہ ایسا کریں تو وہ قانون کی نظر میں مجرم بن

جائیں گے۔ مثلاً لڑکا اگر اپنے ساتھ ایک گرل فرینڈ لے کر گھر میں آئے۔ یا لڑکی ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر میں داخل ہو تو ماں باپ اس کو روک ٹوک کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ معاملہ اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ والدین مجبور ہو کر اپنی بیٹی سے یہ کہنے لگے ہیں کہ تم کو بوائے فرینڈ بنانا ہے تو کسی مسلمان لڑکے کو بناؤ۔

اصل یہ ہے کہ یہاں جو مسلمان آئے وہ ہمہ تن دولت کمانے پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے پاس نہ بچوں کی تربیت کے لیے کوئی موقع رہا اور نہ دین سے وابستگی قائم رکھنے کا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کے مسلمانوں میں بہ مشکل دو فی صد ایسے مسلمان ہوں گے جو مسجدوں اور اسلامی سنٹروں سے جڑے ہوں۔ گویا ۹۸ فی صد تعداد رات دن صرف دنیا میں مشغول رہتی ہے۔ یہ لوگ ابتدائی دینی ذمہ داری بھی پوری نہیں کرتے، داعیانہ زندگی اختیار کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ایسے غرق دنیا لوگوں کا انجام وہی ہونا ہے جو امریکہ کی مسلم نسلوں کا ہو رہا ہے۔

کچھ لوگ اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں جا رہے ہیں۔ مگر جو دنیا پرستانہ ذوق انھوں نے اپنے گھر میں پیدا کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ دوبارہ بھاگ کر امریکہ چلا آتا ہے۔

جناب محمد ذکی الدین شرفی کو یہاں عام طور پر "امام ذکی" کہا جاتا ہے۔ وہ نہایت مخلص اور نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر ان کی سوچ میں منفی انداز اتنا رچ بس گیا ہے کہ وہ انتہائی مثبت واقعہ میں بھی حیرت انگیز طور پر منفی پہلو دریافت کر لیتے ہیں۔ ۱۲ ستمبر کو ایک گفتگو کے بعد میں نے ان کی بابت اپنی ڈائری میں حسب ذیل الفاظ لکھے :

Maulana Zaki has a unique expertise to convert a positive into a negative. In contrast, I always try to find some positive points even from obviously most negative situation.

۱۰ ستمبر کو مولانا ذکی الدین شرفی سے پاکستان اور مسلم ممالک کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ اس تعلق سے لوگوں کو آپ سے کافی شکایت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ساری شکایت غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ان کے اوپر تنقید

کی ہے۔ مگر تنقید تو خود مولانا مودودی کے تیار کردہ دستور جماعت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اسی طرح خلافت وملوکیت میں انھوں نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنقید اور اظہار اختلاف کا کھلا ماحول موجود ہوتا ہے۔ پھر اس پر شکایت کیوں۔

پھر میں نے کہا کہ تنقید کوئی برائی نہیں۔ وہ ذہنی ارتقاء اور تخلیقی فکر (Creative thinking) کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ واحد شرط جو اس سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ تنقید کا تعلق صرف دماغ سے ہونا چاہیے۔ دل کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، اور خدا کے فضل سے یہ بات میرے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو دوسروں پر تنقید کریں اور اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھیں۔ میں مستقل طور پر اپنے آپ کو تنقید کے لیے پیش کرتا رہتا ہوں۔ مثلاً میرا معمول ہے کہ جب میں کوئی نیا مضمون لکھتا ہوں تو اپنی لڑکی ڈاکٹر فریدہ خانم کو دیتا ہوں کہ اس پر تنقید کرو۔ اسی طرح پچھلے تقریباً آٹھ سال تک مولانا انیس لقمان ندوی مستقل طور پر میرے ساتھ تھے۔ وہ دہلی آئے تو میں نے کہا کہ حضرت عمر فاروق کہا کرتے تھے کہ رحم اللہ امرأ اھدیٰ الی عیوبی۔ مولانا انیس لقمان ندوی سے میں نے کہا کہ آپ میرے لیے اس قول کا مصداق بنئے۔ چنانچہ وہ برابر میرے اوپر تنقید کرتے تھے اور میں نہایت شوق سے اس کو سنتا تھا۔

آج کل وہ ایک عرب ملک چلے گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک عرب شیخ سے انھوں نے اپنے بارے میں کہا کہ : انا ناقد اکبر ناقدٍ فی الھند (میں ہندستان کے سب سے بڑے ناقد کا ناقد ہوں)

جو لوگ تنقید سے منع کرتے ہیں وہ اپنی سادگی کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے چوائس تنقید اور بے تنقید میں ہے۔ حالانکہ یہ چوائس تو ہے ہی نہیں۔ حقیقی چوائس جن دو کے درمیان ہے وہ تنقید اور ذہنی جمود ہے۔ یعنی آپ تنقید کو بند کریں تو جو چیز حاصل ہوگی وہ بے تنقید صورت حال نہیں ہوگی بلکہ ذہنی جمود ہوگا۔

پھر میں نے کہا کہ میرے پاس اس بات کے واضح اور متعدد ثبوت موجود ہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر سخت تنقید کے باوجود ان کے بارے میں میرے دل کے اندر بگاڑ نہیں آیا۔

۱۔ ان کے اوپر میں نے صرف علمی تنقید کی۔ میں نے کبھی ان کی نیت پر حملہ نہیں کیا۔ کبھی شخصی تنقیص نہیں کی۔ کبھی عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان استعمال نہیں کی۔ کبھی بھی اخلاص پر شبہ کرنے والی باتیں نہیں کیں۔ ہمیشہ تجزیاتی تنقید کا اسلوب اختیار کیا۔

۲۔ میری تحریروں سے جماعت اسلامی سے وابستگی رکھنے والے افراد بھی متاثر ہوئے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میری طرح وہ بھی جماعت اسلامی سے استعفاء دے دیں۔ مگر میں نے ہر ایسے شخص کو ہمیشہ استعفا دینے سے منع کیا۔ حتیٰ کہ خود میری بیوی ابھی تک جماعت اسلامی کی رکن ہیں اور فہرست ارکان میں ان کا نام چھپا ہوا موجود ہے۔ میری علاحدگی کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ بھی جماعت کی رکنیت سے الگ ہو جائیں۔ مگر میں نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا: جماعت اسلامی کے ارکان کی فہرست میں اپنا نام باقی رہنے دو۔ کیا معلوم کس بہانے اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشش ہو جائے۔

۳۔ تنقید کے باوجود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قدر دانی میرے دل میں باقی رہی۔ اس کے ثبوت میں وہ دیباچہ دیکھا جا سکتا ہے جو میں نے اپنی کتاب "علم جدید کا چیلنج" کے دیباچہ کے طور پر لکھا تھا۔

۴۔ ۱۹۷۱ میں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنے ہی کے لیے لاہور گیا۔ وہاں جب ذیل دار پارک میں ان سے ملاقات ہوئی تو مصافحہ کرتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو واضح طور پر قلبی تعلق کی نشانی تھے۔

۵۔ ہندستان سے میں یہ سوچ کر لاہور گیا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مطالعہ کا جو کمرہ ہے اس میں کچھ دیر کے لیے بیٹھوں گا۔ چنانچہ اسی کمرہ میں میں نے ان سے ملاقات کی۔ اور بالکل عقیدت مندانہ انداز میں دیر تک اس کمرہ میں بیٹھا رہا۔

۱۰ ستمبر کو محمد عادل خان انجینیر (۵۹ سال) کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ وہ ایسٹ ایمپٹن (East Ampton) میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر عورتوں اور مردوں کا ایک مختصر اجتماع ہوا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایک نشست ہوئی جس میں سادہ انداز میں کچھ تذکیری باتیں کہی گئیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل عالم اسلام میں ایک کلمہ

بہت مقبول ہے۔ وہ ہے : الاسلام دینٌ و دولۃ (اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی) یہ دوئی (dichotomy) غیر فطری اور غیر اسلامی ہے۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں ہیں —— دین اور ریاست۔ اسلام صرف دین نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ وہ ریاست بھی ہے۔ حالانکہ یہاں بیج اور درخت والا رشتہ ہے۔ جس طرح بیج بڑا ہو کر درخت بنتا ہے۔ اسی طرح ایمان پہلے قلب انسانی میں متمکن ہوتا ہے۔ اس کے بعد بتدریج ظاہر ہو کر مکمل دین بن جاتا ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ نے کہا کہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی سب سے زیادہ بری حکمراں ہے۔ پچھلے الیکشن میں یہودیوں نے قاضی حسین (جماعت اسلامی) اور نواز شریف (مسلم لیگ) میں الائنس ہونے نہیں دیا۔ ورنہ آج پاکستان میں اسلام پسندوں کی حکومت ہوتی۔

میں نے کہا کہ موجودہ مسلم ذہن پر ہر جگہ یہودی سازش کا نظریہ چھایا ہوا ہے۔ ساری اسلامی تاریخ یہودی سازش کا شکار نظر آتی ہے —— یہودیوں نے سازش کر کے علی اور معاویہ کو لڑوایا اور خلافت راشدہ کا خاتمہ کیا۔ یہودیوں نے تاتاریوں کو استعمال کر کے عباسی خلافت تباہ کی۔ یہ یہودیوں کی سازش ہے۔

۱۰ ستمبر کی شام کو ماونٹ ہالی کی مسجد میں محمد نبیل المصری (۵۱ سال) سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 908-5060640) ان کا سبجکٹ کیمسٹری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے علاقہ کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں اور نماز پڑھاتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی مسجد کے امریکی پڑوسیوں کی طرف سے کیا کچھ مسائل ہیں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مسائل تو خود مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں (المشاکل بین المسلمین والمسلمین) میں نے پوچھا کہ امریکا کے بارے میں آپ کے تجربات کیا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ خدایا، امریکہ کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے (اللھم اعز الاسلام بامریکا)

مختلف ملکوں میں اسلامی حکومت کے قیام کے نام پر جو ٹکراؤ کی تحریکیں چل رہی ہیں، ان کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ اپنے دلوں میں اسلامی حکومت قائم کیجئے، اس کے بعد باہر بھی آپ کی اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی

(اقیموا دولۃ الاسلام فی قلوبکم تقم لکم دولۃ الاسلام)

۱۱ستمبر کو ٹمپل یونی ورسٹی (پنسلوانیا) دیکھنے دوپہر بعد ڈاکٹر عرفان انیس صاحب کے ساتھ روانہ ہوا۔ ٹمپل یونی ورسٹی میں ریلیجن کے شعبہ میں طلبہ اور اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ شعبہ کے موجودہ ہیڈ پروفیسر اکمل ایوب ہیں۔ وہ پیدائشی نابینا ہیں۔ اسی حالت میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق لبنان سے ہے۔

ان کے آفس میں پڑھنے والی مشین دیکھی۔ میں نے کہا کہ اس کو چلا کر دکھائیے۔ انھوں نے انگریزی کی ایک کتاب کھول کر ایک مشین میں رکھی اور بٹن دبایا تو مشین بآواز بلند کتاب کا مضمون پڑھ کر مسلسل سنانے لگی۔ اس مشین کا نام پرسنل ریڈر ہے ——— آخرت میں مادی اشیاء بولیں گی، یہ اس کا کیسا عجیب مظاہرہ ہے۔

ڈاکٹر خالد بلینکن شپ ایک امریکی نومسلم ہیں۔ وہ ٹمپل یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ کافی سنجیدہ تھے۔ ڈاکٹر خالد بلینکن شپ سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ پروفیسر اکمل ایوب کا خیال ہے کہ سب مذاہب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر مذہب میں سچائی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی دی ریلیجن (The Religion) ہے تو اس وقت آپ کے پاس اعتقادی کرائٹیرین کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے لیے ہمارے پاس وہی تاریخی کرائٹیرین ہے جو ساری علمی دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو تاریخی استناد (Historical credibility) حاصل نہیں۔ انھوں نے بدھا کا نام لیا۔ میں نے کہا کہ بدھا کے بارہ میں بھی معلوم نہیں کہ اس کی زبان کیا تھی۔ انھوں نے کہا کہ بدھا کی زبان پالی تھی۔ میں نے کہا کہ خود اسکالرس کے نزدیک ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ بدھا نے پالی زبان میں کلام کیا۔ یہی معاملہ دوسرے لوگوں کا ہے۔ کسی کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے اپنی زبان سے جو الفاظ کہے تھے وہ آج اپنی اصل حالت میں محفوظ ہیں۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ہر بات تاریخی ہے اور علمی طور پر ثابت شدہ ہے۔

۱۱ستمبر کی شام کو مجھے ایک گھر میں لے جایا گیا۔ بظاہر نہایت شاندار گھر تھا۔ آس پاس کا ماحول نہایت سرسبز و شاداب اور کافی کھلا ہوا۔ گھر کی خاتون آئیں۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا:

مولانا صاحب، ہمارے لیے ہر نماز میں دعا کیجئے، اللہ ہمارے گھر میں سکون پیدا کر دے۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کی بظاہر شاندار زندگی کے پیچھے کس قدر غیر شاندار زندگی ہے۔

ٹمپل یونی ورسٹی سے واپس ہو کر ہم لوگ جناب عثمان رومی کے مکان پر پہنچے جو یہاں کے ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے (Tel. 609-4242064)۔ یہاں تعلیم یافتہ مردوں اور خواتین کا ایک اجتماع تھا۔ مغرب کی نماز یہاں مکان کے بیسمنٹ میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد مولانا ذکی الدین صاحب نے ایک تمہیدی تقریر کی۔ پھر میں نے خطاب کیا۔

میرے خطاب کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ لوگ جو امریکہ آئے وہ تقریباً سب کے سب مادی غرض سے آئے اور مادی غرض سے آنا اسلام میں کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ تاہم یہ آپ کے لیے کوئی برائی کی بات نہیں۔ قرآن میں ہے کہ مومن کی سیئات کو بھی حسنات میں تبدیل کر دیا جاتا ہے (الفرقان ۷۰) پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا بظاہر غیر محمود سفر محمود سفر نہ بن جائے۔

میں نے کہا کہ امریکہ میں آکر بسنے کے معاملہ میں اب آپ یہ کریں کہ وہ نیت کر لیں جو صحابہ کرام کی نیت تھی۔ وہ بھی عرب سے نکل کر باہر کے ملکوں میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے تجارتیں بھی کیں۔ مگر ان کی نیت یہ تھی کہ تمام انسانوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کے سفروں کو اتنی برکت دی کہ اسلام قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقوں میں پھیل گیا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ واقعۃً اس قسم کا ارادہ کر لیں تو صحابہ کی تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ جس طرح پہلے زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں پھیلا تھا اسی طرح اسلام جدید نسلوں میں بھی پھیل جائے گا۔

پھر میں نے کہا کہ تاریخ کے اعادہ کا یہ پراسس بالفعل شروع ہو چکا ہے۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کے انٹرایکشن کی بنا پر لوگ اسلام سے قریب آرہے ہیں۔ صرف امریکہ میں چار بلین سے زیادہ لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

۱۲ ستمبر کی صبح کو حسب معمول سوال و جواب کی صورت میں ایک گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ مولانا ذکی الدین شرفی کانفرنس میں آنے والوں کے خیالات، اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ریکارڈ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں میری بھی کئی تفصیلی گفتگو انھوں نے ریکارڈ کی ہے۔

اس کے بعد ساڑھے دس بجے ان کے مشورہ پر امریکہ کے دیہات دیکھنے کے لیے ہم

دونوں روانہ ہوئے۔ پہلے ہم لوگ بڑے بڑے زرعی فارموں سے گزرے جو سڑک کے دونوں طرف دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ تمام فارم نہایت منظم تھے اور ان کا کوڑا تو درکنار، ان کا کوئی تنکا بھی سڑک پر یا فٹ پاتھ پر نظر نہ آیا۔ دیہات کے علاقے قابل دید تھے۔ دور دور بنے ہوئے خوب صورت مکانات، ہر مکان کے چاروں طرف صاف ستھرا سرسبز ماحول، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دیہات نہیں ہیں بلکہ مسلسل پھیلے ہوئے سرسبز پارک ہیں جن کے درمیان کہیں کہیں رہائشی مکانات کھڑے ہوئے ہیں۔ ان دیہاتوں میں، کمیونی کیشن اور ٹرانسپورٹ اور سڑکوں وغیرہ کی سہولت بھی اعلیٰ درجہ میں موجود تھی۔

ایک جگہ کھلے میدان میں ایک ہی رنگ کی بہت سی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اسکول کی بسیں ہیں۔ یہاں گورنمنٹ کی طرف سے ۱۲ ویں درجہ تک کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے بچوں کو لانے اور لے جانے کا مفت انتظام ہے۔ طالب علم کا گھر کہیں بھی ہو، صرف ایک طالب علم کو لینے کے لیے بس وہاں تک جائے گی۔ اس کا اصول یہ ہے کہ گھر اور اسکول کے درمیان اگر ایک میل کا فاصلہ ہے تو طالب علم کو خود چل کر اسکول پہنچنا ہے، اور اگر ایک میل سے زیادہ ہے تو گورنمنٹ بس اس کو لانے اور لے جانے کی ذمہ دار ہے۔

مولانا ذکی صاحب نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی۔ یہاں ایک سفید خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف نہایت صاف ستھرا ماحول تھا۔ ہندستانی معیار کے اعتبار سے بظاہر وہ گورنر کا ریسٹ ہاؤس معلوم ہوتا تھا۔ مگر مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ یہ اس گاؤں کا پوسٹ آفس ہے۔ وہاں جاکر انھوں نے کچھ ڈاک کا کام کیا اور اس کے بعد واپس آگئے۔

راستہ میں ایک بہت وسیع عمارت تھی۔ اس کے باہر ایک پتھر پر لکھا ہوا تھا:

Deborah Heart and Lung Centre

معلوم ہوا کہ یہ دنیا میں دل اور پھیپھڑے کے علاج کا سب سے بڑا ہسپتال ہے۔ کوئی مریض یہاں آجائے تو اس کو فوراً داخل کرکے اس کا معیاری علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ فیس دینے کے قابل ہے تو فیس دیتا ہے ورنہ اس کا پورا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ ایک پاکستانی مسلمان یہاں آکر بیمار پڑ گئے۔ ان کا پورا علاج یہاں مفت کیا گیا۔ حالانکہ

اس کی فیس لاکھوں ڈالر بن رہی تھی۔ یہ اسپتال زیادہ تر عوامی عطیات سے چلایا جاتا ہے۔

۱۲ ستمبر کی شام کو حسب پروگرام مسٹر بھرت جانی آئے (Tel. 908-2831863) ان کے ساتھ چل کر ڈیٹن (Dayton) پہنچا۔ یہاں مسٹر کملیش شاہ (Tel. 908-3294006) کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تقریباً پچاس کی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو اکٹھا ہوئے۔

ان کے سامنے خطاب کرتے ہوئے میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ——

اختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسانی سماج سے اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ پھر مل جل کر رہنے کا ماحول کیسے بنایا جائے۔ اس کا ایک ہی راز ہے، وہ ہے اختلاف کو برداشت کرنا۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ اختلاف کو قلبی نفرت نہ بننے دینا۔

تقریر کے بعد مختلف سوالات ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اسلام کی کچھ دعائیں بتائیے۔ میں نے چند دعائیں عربی میں سنائیں اور پھر ان کا ترجمہ کیا۔ ایک دعا یہ تھی: اللھم اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً۔

کملیش صاحب کے مکان کے ایک بڑے کمرہ میں یہ میٹنگ ہوئی۔ لوگوں نے کئی باتیں بتائیں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ آج ہی میں نے ریڈیو پر ایک قصہ سنا جو کل پیش آیا ہے۔ ایک ایشیائی باپ اپنی بیمار لڑکی کو لے کر بالٹی مور جا رہا تھا۔ وہاں کے ایک اسپتال میں اس کا اپوائنٹمنٹ تھا۔ راستہ میں اس کی کار کے انجن میں کچھ پرابلم پیدا ہو گیا۔ اس نے ایک میکینک کو دکھایا۔ کار میں ایک نیا پرزہ ڈالنے کی ضرورت تھی جو فوری طور پر دستیاب نہ تھا۔ میکینک نے مشورہ دیا کہ آپ رنٹ پر کار لے کر چلے جائیں اور گاڑی یہیں چھوڑ دیں۔ مگر فوری طور پر کرایہ کی کار نہ مل سکی۔

اب سوال تھا کہ کیا کیا جائے۔ کیونکہ لڑکی بیمار تھی اور فوراً روانہ نہ ہونے کی صورت میں وہ وقت پر اسپتال پہنچ نہیں سکتا تھا جو وہاں سے چار سو میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ میکینک نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ میں آپ کو اور آپ کی لڑکی کو لے کر چلتا ہوں۔ چنانچہ میکینک اپنی گاڑی پر بٹھا کر ان کو لے گیا۔ اس آمد و رفت میں میکینک کے ۱۶ گھنٹے خرچ ہوئے۔ یہ سب کچھ اس نے رضا کارانہ طور پر کیا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

۱۳ستمبر کو فجر کی نماز ماونٹ ہالی کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد چائے پر کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ محمد کامل مدنی (۴۷ سال) بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ہندستان میں ان کی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے پھر امریکہ آئے اور اب یہاں ایک اچھا جاب کر رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ انڈیا سے میں اس لیے چلا آیا کہ وہاں میں نے دیکھا کہ تعصب ہے اور مسلمان کے لیے ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ صرف آدھی بات کہہ رہے ہیں۔ پوری بات یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے فرقہ پرست لیڈروں کی رہنمائی میں ہندو مسلم تفریق کا ہنگامہ برپا کیا۔ انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ اس کے بعد وہی ہونا تھا جو وہاں ہوا۔ اگر امریکہ میں مسلمانوں کا کوئی قائد اعظم پیدا ہو جائے۔ وہ یہاں مسلمانوں اور امریکنوں کے درمیان تفریقی تحریک چلائے اور یہاں کے مسلمان اسی طرح ان قائد اعظم صاحب کا ساتھ دیں جس طرح انھوں نے غیر منقسم ہندستان میں ساتھ دیا۔ تو آپ لوگوں کا انجام امریکہ میں اس سے بھی زیادہ برا ہوگا جو ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں ہوا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔

چپس کا پیکٹ کھولا گیا تو اس میں سے ایک خوب صورت چھپا ہوا کاغذ نکلا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ اس کاغذ کو دکھا کر ہمارے اسٹور سے آپ فلاں فلاں چیز ایک ڈالر کم میں خرید سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو آپ لوگ کنزیومرزم کہتے ہیں۔ ایک انجینیر صاحب جو دسترخوان پر تھے، انھوں نے کہا کہ "کنزیومرزم" کا لفظ آپ نے کس طرح جانا۔ ایک صاحب نے جواب دیا—— آپ امریکہ میں رہتے ہیں، وہ امریکہ کے بارہ میں پڑھتے ہیں۔

نیویارک میں جیوے پاکستان (Tel. 718-793-1915) کے نام سے ایک ٹی وی ادارہ ہے۔ اس نے ۲۶ اگست ۱۹۹۶ کی شام کو ایک تفصیلی انٹرویو اپنے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا۔

پہلے ۱۰ منٹ تک میں نے اسلامی مرکز کی تاریخ اور اس کی سرگرمیوں کے بارہ میں بتایا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں میں ایک عمومی بے حوصلگی آگئی تھی۔ عام ذہن یہ بن گیا تھا کہ اس ملک میں ہمارے لیے مواقع نہیں۔ یہاں صرف تعصب اور تشدد ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندستان کے مسلم رہنما صرف شکایت اور احتجاج کے الفاظ

لکھنے اور بولنے میں مشغول تھے۔ ہم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بتانا شروع کیا کہ ان کے لیے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں۔ آج خدا کے فضل سے ہندستانی مسلمانوں میں نیا حوصلہ جاگ اٹھا ہے۔ اب وہ وہاں عزم و ہمت کے ساتھ زندگی کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد ۲۰ منٹ تک ایمان، عبادت، اسلامی اخلاق، صبر و اعراض اور دعوت کے موضوع پر کلام کیا۔ انٹرویو کے آخر میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لئے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا پیغام یہ ہے کہ وہ یہاں قرآن کے الفاظ میں نفع بخش بن کر رہیں۔ وہ یہاں بوجھ (liability) نہ بنیں بلکہ وہ یہاں کے لیے سرمایہ (asset) بن جائیں۔ وہ صرف لینے والے بن کر نہ رہیں بلکہ دینے والے بن کر رہنے کی کوشش کریں۔

ایک پاکستانی مسلمان نے افسوس کے انداز میں کہا کہ "قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ ہم سب پاکستانی ہیں، اور ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔ مگر پاکستان کی نئی نسل اس سبق کو بھولتی جا رہی ہے۔ اس کو نہ پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور نہ اسلام پر فخر۔"

میں نے کہا کہ آپ صرف نئی نسل کو کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسے لاکھوں لوگ پاکستان کو چھوڑ کر امریکہ میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ کیا وہ خود بھی اس کا مصداق نہیں ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو سچ مچ پاکستان اور اسلام پر فخر ہوتا تو آپ ہرگز پاکستان اور اسلامی جمہوریہ کو چھوڑ کر یہاں نہ آتے۔

پھر میں نے کہا کہ فخر کی بات بذات خود ہی غلط ہے۔ اسلام ہمارا فخر نہیں ہے۔ اسلام ہماری ذمہ داری ہے۔

امریکہ میں مقیم پاکستانی ہر سال یہاں پاکستانی میلہ مناتے ہیں۔ ۸ اگست ۱۹۹۴ کو نیویارک میں جو میلہ منایا گیا اس موقع پر ایک سوینیر چھاپا گیا تھا، اس کو میں نے دیکھا۔ اس میں ایک مضمون تھا قیام پاکستان: اسلامیان ہند کے طویل سفر کی منزل۔ اس مضمون کا خاتمہ ان سطروں پر ہوا تھا:

"قائد اعظم محمد علی جناح (پاکستان کی مانگ پر) کوہ ہمالیہ کی مانند ڈٹے رہے، اور اپنا مطالبہ پورا کرایا۔ اس موقع پر مسز وجے لکشمی پنڈت نے کہا کہ اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی، ایک سو ابو الکلام آزاد اور ایک سو پنڈت جواہر لال نہرو ہوتے اور کانگریس میں صرف محمد علی جناح ہوتے

تو ملک کبھی تقسیم نہ ہوتا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ کو قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ اور یوں دنیا کے نقشہ پر ایک اسلامی مملکت ابھری۔ اور وہ سلطنت جس کا چراغ ۱۸۵۷ میں گل ہوا تھا پھر اس کا دیا فروزاں ہوا اور مسلمان ایک اسلامی سلطنت کے وارث بنے۔ آج پاکستان مسلمانوں کے لیے ایک قلعہ ہے۔ وہ دنیائے اسلام کا اہم ترین ملک ہے۔"

میں نے ایک پاکستانی مسلمان سے کہا کہ جب سو سال پہلے بھی زیادہ لمبی مدت کے بعد اسلام کا قلعہ اور اہم ترین اسلامی ملک وجود میں آگیا تو وہاں کے تمام بہترین افراد ملینوں کی تعداد میں پاکستان سے نکل کر یورپ اور امریکہ کیوں چلے آئے۔ پھر تو آپ لوگوں کو خوشی اور اطمینان کے ساتھ وہاں رہنا چاہیے تھا۔ مگر اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے کہا کہ پھر تو خود اپنے عمل سے آپ اس کی تردید کر رہے ہیں۔ آپ خود بتا رہے ہیں کہ یہ الفاظ محض ایک شاعری ہے، حقیقت واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

امریکی اخباروں میں ہندستان کی خبریں بہت کم ہوتی ہیں۔ میرے طویل مدت قیام میں صرف ایک بار تفصیلی خبر تھی۔ یہ امرناتھ یاترا کے بارہ میں تھی جس میں شدید طوفان کے نتیجہ میں تقریباً ڈھائی سو آدمی مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ دی نیویارک ٹائمس (۲۷ اگست ۱۹۹۶) میں صفحہ اول پر سری نگر کی ڈیٹ لائن کے ساتھ جان ایف برنس (John F. Burns) کی رپورٹ چھپی تھی۔

مذکورہ رپورٹر ۳۴ سال پھل فروش جگدیش کیلا سے اسپتال میں ملا جو خود بھی اس حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ رپورٹ کے مطابق، کیلا نے حادثہ کی ہولناک تفصیلات بتائیں۔ اس نے اس کو نرک کی یاترا قرار دیا:

...what he called his pilgrimage to hell.

جگدیش کیلا نے بتایا کہ جب طوفان آیا تو وہاں مکمل بے بسی کا عالم تھا۔ ہر شخص دہشت کی حالت میں تھا۔ لوگ برف میں پھنسے ہوئے مدد کے لیے چلا رہے تھے۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ بھگوان کے لیے مجھے بچاؤ:

For God's sake, save us.

امرناتھ میں شیو دیوتا کا مندر ہے۔ وہاں لوگ شیو کی پوجا کے لیے جاتے ہیں۔ مگر

عجیب بات ہے کہ یہ پجاری جب برف و باد کے طوفان میں پھنس گئے تو اس وقت ان میں سے کوئی شیو کو پکارنے والا نہ تھا۔ ہر ایک صرف بھگوان (خدا) کو پکار رہا تھا ——— فطرت صرف ایک خدا کو جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگین حالات میں جب ذہن کی مصنوعی تہیں ہٹتی ہیں اور صرف فطرت باقی رہ جاتی ہے، اس وقت ہر آدمی ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ کیونکہ اصل فطرت کی سطح پر وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو جانتا ہی نہیں۔

ایک امریکی نوجوان نے ہائے (Hi) کہا۔ اس کے بعد ایک لفظ کہا جو مجھ کو وَسَپ سنائی دیا۔ یہ دوسرا لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ دراصل (What is up) کا مخفف ہے۔ یعنی کیا حال ہے۔ کیسا چل رہا ہے۔ اس قسم کے مخففات اردو میں بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر دوسری زبانوں میں وہ بہت زیادہ ہیں۔ اردو کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ اس میں بول چال کی زبان بھی تقریباً وہی ہے جو کتاب کی زبان ہے۔ مگر دوسری زبانوں میں ایسا بہت کم ہے۔

عربی زبان میں یہ حال ہے کہ علماء اور شیوخ تک روزمرہ کی گفتگو میں عامی زبان بولتے ہیں جو کم از کم آواز کے اعتبار سے کتابی زبان سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اکثر مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک صاحب جو نیویارک میں عربوں کے ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ عربوں کے بچے عربی زبان سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں اب ان کی زبان عملاً انگریزی بن گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عرب والدین اپنے بچوں کو عربی سکھانے کے لیے ٹیوٹر رکھتے ہیں، مگر بچے اس سے بھاگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیوٹر ان کو کتابی زبان پڑھاتا ہے۔ یہ بچے اپنے ماں باپ کو عامی زبان بولتے ہوئے سنتے ہیں۔ اس لیے یہ کتابی زبان ان کو ایک نئی زبان معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

مگر اردو میں یہ مسئلہ نہیں۔ کیوں کہ اردو زبان بولنے والا عین وہی زبان بولتا ہے جو کتابوں میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے ایک آدمی جو اردو زبان سمجھتا ہو، اس کے لیے اردو سیکھنا عملاً صرف اس کی کتابت سیکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ کیوں کہ اصل زبان کو تو وہ پہلے ہی سے جان رہا ہوتا ہے۔ جب کہ عربی میں ایسا نہیں ہے۔

امریکہ کا مشہور انگریزی روزنامہ نیویارک ٹائمس ۱۸۵۱ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے

صفحہ اول پر یہ ماٹو لکھا ہوا رہتا ہے ——— تمام خبریں جو چھاپنے کے لائق ہیں :

All the news that's fit to print.

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اس کے بجائے یہ لکھا جائے کہ ——— تمام خبریں جو ہماری پیپر انڈسٹری کے لیے موزوں ہیں :

All the news that's fit to our industry.

جناب ابراہیم صاحب کا دل کا آپریشن ہوا ہے۔ انھوں نے قمیص اٹھا کر دکھایا تو سینہ کے بیچ میں سیدھا لمبا نشان تھا۔ اصل یہ ہے کہ دل کے آپریشن میں سامنے کی ہڈیاں درمیان سے کاٹ دیتے ہیں تاکہ ڈاکٹر کا ہاتھ آدمی کے دل تک پہنچ سکے۔ آپریشن مکمل کرنے کے بعد ہڈیوں کے دونوں سرے ملا کر ٹانکا لگا دیتے ہیں۔ اس کے بعد فطری طور پر آسٹیوبلاسٹ (Osteoblast) کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی ہڈیوں کے کٹے ہوئے سروں پر بون سیل (bone cells) تیزی کے ساتھ بننے لگتے ہیں اور وہ بہت کم مدت میں ہڈیوں کو دوبارہ جوڑ دیتے ہیں۔ یہ سارا عمل اپنے آپ فطری نظام کے تحت انجام پاتا ہے۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین نے مسلمانوں کے اندر یہ شعور جگایا کہ تم خدا کی طرف سے قیادت کے لیے مقرر کیے گئے ہو۔ تم ساری دنیا کے اوپر قائد ہو۔ یہ بات اسلام اور عقل دونوں کے اعتبار سے بے اصل تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں من تواضع رفعہ اللہ کا اصول ہے۔ یعنی بندہ تواضع کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے اس کے لیے قیادت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اسلام کا پورا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ سب سے پہلے اہل ایمان کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم خدا کے بندے ہو اور تم کو بندہ والی صفت کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے (الذین یمشون علی الارض ھونا) پھر عورتوں کو گھر کے اندر یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم کو مرد کی قوامیت کے تحت اپنی زندگی گزارنا ہے۔ اسی طرح مردوں کو ہر رات اور دن کے درمیان پانچ بار اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ ان کا صرف ایک امام ہو اور تمام لوگ مستقل طور پر اس کے مقتدی بن جائیں۔

اس طرح اسلام تمام مردوں اور عورتوں کے اندر اس احساس کی پرورش کرتا ہے

کہ تم کسی کے ماتحت ہو۔ اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کے اندر تمام افراد احساس ماتحتی میں زندگی گزار رہے ہوں۔

کسی ملک میں ایک بلین آدمی ہوں تب بھی ان کا سردار ایک ہی ہوگا۔ ایک کم ایک بلین آدمی جب ماتحتی پر راضی ہوتے ہیں تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کے اندر کوئی متحدہ نظام قائم کیا جائے۔ اس لیے کسی قوم میں امامت و قیادت کا شعور جگانا گھر یا قوم کے افراد کو الٹی خوراک دینا ہے۔ عملاً تو صرف ایک کو چھوڑ کر پوری کی پوری قوم کو ماتحتی اختیار کرنا ہوتا ہے اور آپ تمام کے تمام لوگوں کے اندر سرداری کا احساس ابھار دیتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف آپس میں لڑیں گے، وہ کبھی کوئی متحدہ نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

امریکہ میں مجھے ایک مسلمان انجینیر کے یہاں لے جایا گیا۔ ہم پہنچے تو بنگلہ نما ایک شاندار مکان کے سامنے دو بڑی آٹومیٹک گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سب بینک سے سودی قرض لے کر حاصل کیا گیا ہے۔ یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا فتنہ ہے جس میں ۹۹ فی صد سے زیادہ لوگ مبتلا ہیں۔ اس فتنہ کے پیچھے جو کشش ہے وہ اتنی طاقت ور ہے کہ اس سے غیر متاثر رہنا صرف ولی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

پہلے ایسا ہوتا تھا کہ آدمی زندگی بھر محنت کر کے کماتا تھا اور پیسہ جمع کرتا رہتا تھا۔ پھر آخر عمر میں اس کے لیے ممکن ہوتا تھا کہ وہ جمع شدہ رقم کو استعمال کر کے اپنے لیے ایک پسندیدہ گھر بنا سکے۔ مگر یہ پسندیدہ مکان عملاً اس وقت ملتا تھا جب کہ اس کی زندگی کا آخر وقت آجاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جدید نظام یہ موقع دیتا ہے کہ زندگی میں داخل ہوتے ہی اول دن تم اپنے لیے ایک پُر رونق مکان حاصل کر لو اور اس کے اندر پوری عمر شاندار زندگی گزارو۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تم بینک سے سودی قرض لے لو اور پھر بعد کو اپنی کمائی سے قسط وار صورت میں اس کو ادا کرتے رہو۔

فانی بدایونی کے زمانہ میں دنیا کی کشش کے اسباب آج کے مقابلہ میں بہت کم تھے۔ اس کے باوجود انھیں کہنا پڑا :

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

سوال

آپ کی کتاب فکر اسلامی پڑھی بظاہر اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک حریت پسند آدمی ہیں۔ کیا یہ لفظ آپ کے لئے بولنا درست ہوگا (ابرار احمد، سورت)

جواب

حریت پسند کا لفظ میرے لئے درست نہیں۔ اگر آپ میری تمام کتابیں پڑھیں تو آپ کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پورا فکر قرآن وحدیث اور علماء حق کے مطالعہ سے ماخوذ ہے۔ میں مکمل طور پر "تقلیدی اسلام" کا حامی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں قدیم بات کو جدید اسلوب میں بیان کرتا ہوں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مرحوم قاری محمد طیب صاحب ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے..... مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں۔

سوال

قربانی (ذبیحہ) جذبۂ رحم کے منافی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جانوروں کے تڑپنے کے بعد جو گوشت ہمیں کھانے کو ملتا ہے اس کی تڑپ اگر ذہن میں رکھئے تو کھانے کا جی نہیں چاہتا۔ جب کہ یہ گوشت کھانا اسلام میں جائز ہے۔ (شکیل احمد، ورورہ، چندرپور)

جواب

یہ مسئلہ صرف قربانی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود قانون فطرت کا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، آپ خواہ کچھ بھی کریں۔ ہوا میں سانس لیں، پانی پئیں، سبزی کھائیں، دودھ پئیں۔ ہر حال میں آپ جانوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ قربانی میں ایک جانور کو ہلاک کیا جاتا ہے اور عام حالات میں بیکٹیریا کو۔ اور زندہ جسم ہونے کے اعتبار سے جانور اور بیکٹیریا میں کوئی فرق نہیں۔

زندہ رہنے کے لئے ہمیں خوراک کی ضرورت ہے۔ اور فطرت نے زندہ اشیاء ہی کو ہماری خوراک بنایا ہے۔ غیر زندہ اشیاء (مردہ حیوان یا پتھر وغیرہ) کو ہم اپنی خوراک نہیں بنا سکتے ۔ ایسی حالت میں اصل سوال قربانی کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آدمی زندہ رہے یا خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لے۔ کسی کو یہ حق تو ہے کہ وہ کھانا پانی چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاک کر لے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ قربانی نہ کرو۔ کیوں کہ قربانی تو ہر آدمی عملاً کر رہا ہے۔ ہر آدمی ہر لمحہ ہزاروں جانوں کو مار کر انہیں اپنی خوراک بناتا ہے اس کے بعد ہی وہ اس دنیا میں زندہ حالت میں باقی رہتا ہے۔ قربانی اس دنیا میں زندگی کا ایک عام قانون ہے، وہ مخصوص طور پر جانور کے ذبیحہ سے متعلق مسئلہ نہیں۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ چیزوں سے نہیں ہوتا، خدا سے ہوتا ہے۔ خدا سے ہونے کا یقین اور اسباب سے کچھ نہ ہونے کا یقین یہ کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے بارے میں بتائیں۔ (شکیل احمد، چندرپور)

جواب

اس مسئلہ کا جواب حدیث (الترمذی، کتاب القیامہ) میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک مسلمان نے کہا کہ اے خدا کے رسول میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں ۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلھا واتوکل او اطلقھا واتوکل قال اعقلھا وتوکل)

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہے یہی معاملہ توکل کا ہے۔ اس دنیا کا نظام بظاہر اسباب و علل پر قائم ہے۔ یہاں کے حالات کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح اسباب

کی رعایت کرتے ہوئے اپنا عمل کرے۔ اس کے باوجود اس کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا ہے۔ پھر بھی اس کی کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے ہر قسم کے اسباب فراہم کرے، مگر داخلی طور پر اس کا یقین یہ ہو کہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا۔ خدا کے حکم کے بغیر یہاں نہ کسی کو کچھ ملنے والا ہے اور نہ کسی سے کچھ چھینا جانے والا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ زکاۃ اور صدقات میں برکت ہے اور سود میں برکت نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ براہ کرم تشریح فرمائیں۔ (مشتاق احمد، دہلی)

جواب

یہاں برکت کا لفظ کسی پر اسرار معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ معلوم اقتصادی معنی میں ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ زکاۃ یا صدقہ دوسروں کو دینے کا عمل ہے۔ اس کے برعکس سود دوسروں سے لینے کا عمل۔ کسی سماج میں جب ایسا ہو کہ لوگ اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دینے لگیں تو وہاں عمومی خوش حالی پیدا ہوگی۔ کمایا ہوا مال صرف کمانے والے کے پاس نہیں رہے گا بلکہ توسیع پاکر وہ دوسروں تک بھی پہنچتا رہے گا۔ اس کے مقابلہ میں سودی نظام میں یہ ہوگا کہ کچھ لوگ قرضوں کے ذریعہ دوسروں کے مال کا ایک حصہ اپنے لئے حاصل کرتے رہیں گے۔ سماج کی دولت پورے سماج میں گردش نہیں کرے گی بلکہ وہ کچھ افراد کے پاس سمٹ کر رہ جائے گی۔ یہی مطلب ہے بے برکتی کا۔ زکاۃ اور صدقہ کا طریقہ خوش حالی کو عمومی بناتا ہے۔ اور سود کا طریقہ خوش حالی کو کچھ لوگوں تک محدود کر دیتا ہے۔

سوال

آپ غیر مسلموں کے اجتماعات میں جاتے ہیں۔ دعوتی اعتبار سے یہ ایک اچھی بات ہے۔ مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے، آپ وہاں اسلامی عقائد کو پیش نہیں کرتے۔ بلکہ اسلام کے اخلاقی تعلیمات اور معاملات کو پیش کرتے ہیں۔ دعوت کا یہ طریقہ درست نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ سنت نبوی کے مطابق اسلامی عقائد کو ان کے سامنے پیش کریں (زکی نور عظیم ندوی، لکھنؤ)

جواب

آپ کی یہ اطلاع درست نہیں، دعوت کوئی ایک ریکارڈ بجانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخاطب کی نفسیات اور موقع و محل کی رعایت سے کوئی بات پیش کرنے کا نام ہے۔ اور میں خدا کے فضل سے یہی کرتا ہوں۔ مثلاً غیر مسلموں کے ایسے کئی اجتماعات ہیں جن میں میں نے ویدانت کی فلاسفی (ادویت واد) کے مقابلہ میں اسلام کے تصور توحید کو پیش کیا۔ بعض اجتماعات میں جہاں ایسے لوگ اکٹھا تھے جو اسلام کو تشدد پسند مذہب سمجھتے تھے، ان کے سامنے اسلام کو رحمت کلچر کے طور پر پیش کیا۔ اسی طرح بعض اور اجتماعات میں جہاں ایسے مخاطبین تھے جو اسلام کی تاریخ کے بارے میں شک و شبہ میں تھے، وہاں اسلامی تاریخ کی صحیح تصویر پیش کی۔ بعض اور مواقع پر جہاں محسوس ہوا کہ لوگ اسلام کے نام سے متوحش ہوتے ہیں وہاں یہ توحش دور کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اسلام کا مطالعہ کرنے لگیں۔ بعض مواقع پر جہاں لوگ مسلمانوں کے بعض اعمال کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں بدگمان ہو رہے تھے۔ وہاں بتایا کہ اسلام کو سمجھنے کا ماخذ قرآن و سنت ہے نہ کہ مسلمانوں کی روش۔ یہی طریقہ سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ اسی کو ایک صحابی نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: کلم الناس علی قدر عقولہم۔

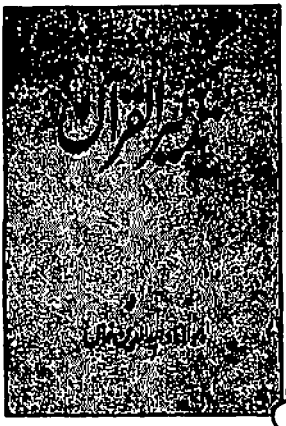

تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

نصف رعایت

ہدیہ : 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

مصنف کی تحریریں مسلسل پڑھنے کے لئے

ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کیجئے

اسلام کی فطری دعوت اور اس کے ابدی
پیغام کو جدید اسلوب میں سمجھنے کے لئے
الرسالہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98